زندگی ہے تو کہانی بھی ہوگی

(علی گڑھ کی یادیں)

فیاض رفعت

مصنف کی دیگر کتابیں

۱۔ نئے عہد نامے کی سوغات (افسانے)

۲۔ میرے حصّے کا زہر (افسانے)

۳۔ بیتی رتوں کا منظر نامہ (نظمیں)

۴۔ زندہ اپنی باتوں میں۔

بیدی، عصمت اور عباس (انٹرویو)

۵۔ اُردو افسانے کا پس منظر (تنقید)

۶۔ اندرا گاندھی (تالیف)

۷۔ نقدِ آگہی

۸۔ رات بھر کا سُورگ (ہندی میں کہانیاں)

۹۔ خواب دریچہ (ہندی میں نظمیں)

زندگی ہے تو کہانی بھی ہوگی

(علی گڑھ کی یادیں)

فیاض رفعت

نام کتاب : زندگی ہے تو کہانی بھی ہوگی

مصنف : فیاض رفعت

پتہ : ایلڈیکو گرین [illegible] ڈریم وِلا، لوہیا نگر، لکھنؤ۔۲۲۶۰۱۰

۱۔ سی۔[illegible] ہریندر پارک، [illegible] ہاؤسنگ سوسائٹی،

۲۔ نیا نگر، میرا روڈ (مشرق) تھانے، ممبئی۔۴۰۱۱۰۷

تعداد : چار سو

اشاعتِ اوّل : جنوری ۲۰۰۸

طابع : اصیلا آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی

ناشر : مصنف

قیمت : دو سو روپے۔ دس ڈالر

رابطہ: موبائل 09936188786 09935148009

فون 0522-4065399 ۔ 022-28115201

ملنے کے پتے:

- ☆ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لعل کنواں، دہلی
- ☆ مکتبہ جامعہ، دلّی، علی گڑھ، ممبئی
- ☆ کتاب دار ممبئی
- ☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

معیار پبلی کیشنز

کے۔۳۰۲ تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی ۱۱۰۰۳۱

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی گریجویٹ

اپنی سب سے چھوٹی بہن

شمیم ریاض

کی یاد میں

عالم خورشید، ارشد رضا، عبیداللہ ناصر، عالم نقوی، محمود ایوبی،
عابد سہیل، امان عباس، یعقوب راہی، انور قمر، فرحان حنیف،
کمل مینائی، اشعر نجمی اور عبدالاحد ساز کے نام

-- فیاض رفعت

Read not to contradict and confute,

Nor to believe and take for granted,

Nor to find to talk and discourses,

But to weigh and consider.

---Francis Bacon.

لمحے کی داستان

''مولسری پر کبھی خزاں آتی تھی اور ہم جالیوں کے پاس مسجد کی باہر والی دیوار کے ساتھ کان لگا کر اپنے پیاروں کے دلوں کی دھڑکن سنتے تھے۔ زمین کی گہرائیوں میں پوشیدہ، ندی میں آکر بکھر جانے والے پانی کی بے قراری کو اپنے لہو میں محسوس کرتے تھے۔ مولسری کے نیچے مسجد کے پچھواڑے، سرسیّد احمد خاں کی قبر کے سرہانے دیوار کی دوسری طرف واقع اس چھوٹے سے تالاب میں پانی ہردم بدلتا رہتا تھا....''

صلاح الدین محمود

ترتیب

ہستی کے مت فریب میں آجائیو، اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

تماشا

گیارہ نومبر دو ہزار چالیس!
اندھیرے کے آخری پہر سے طلوع
ہوتی ہوئی ایک ننھی سی کرن
نومولود بچے کی پیشانی
کو چومتے ہوئے مسکراتی ہے
اور گاؤں کی مسجد کے میناروں
پر پھیل جاتی ہے
پھر نوبت اور شہنائی کی
آوازوں کے بیچ
انگڑائی لیتا ہوا خمار آلود دن،
آنکھیں کھول دیتا ہے
کہ بس اب تماشا
شروع ہوا چاہتا ہے

میں اور وہ لڑکا

گاؤں کا ایک لڑکا جو اسکول جانے کے بجائے چلچلاتی دھوپوں اور لو' کے تھپیڑوں کی پرواہ کئے بغیر آموں کے باغ میں ٹپکے بینتا ہے۔

اسکول کا بستہ اور تختی کسی پیڑ کی شاخ سے لٹکا کے کولوں اور بموں میں ڈبکیاں لگاتا ہے۔

اسکول میں ماسٹر چھوٹے خاں کی آنکھیں اور چھدری ڈاڑھی دیکھ کر اسے خوف آتا ہے۔ لڑکے کو املاء اور انشاء سے دور کا واسطہ نہیں۔

''مچھلیاں پانی میں تیرتی ہیں''......... اسے ''مچھلیاں'' لکھنا نہ آیا۔ عمر کے پڑاؤ آتے جاتے رہے۔ لڑکے کی کچھ کتابیں چھپ گئیں مگر آج بھی جب کہ وہ لڑکا ساٹھ برس کے پیٹے میں ہے، مچھلیاں لکھتے وقت اس کا قلم جھجکنے لگتا ہے۔

✪✪✪✪

گاؤں سے رشتہ ٹوٹے پچپن برس ہوگئے۔ زندگی کے دشت میں پھول بھی کھلے اور کانٹوں کی آبیاری بھی ہوئی۔ بوریہ نشیں یہ لڑکا کھیتوں، کھلیانوں کو نہیں بھولا، گڑ، باجرے کی روٹی، گھی اور دودھ کا ملیدہ آج بھی اس کی مرغوب غذا ہے۔

✪✪✪✪

بچپن کا ایک اور منظر چھٹی کلاس کا نتیجہ بتلا دیا گیا ہے۔ وہ لڑکا سسکیاں بھر رہا ہے۔ کلاس ٹیچر مشرف صاحب پوچھتے ہیں۔ ابے روتا کیوں ہے؟

''ماسٹر صاحب میں فیل ہوگیا۔ گھر کیسے جاؤں؟'' ماسٹر صاحب لڑکے کے ہاتھ سے رزلٹ کارڈ اچک لیتے ہیں اور جہاں ایک خانے میں فیل لکھا ہوا تھا اسے کاٹ کر Promoted لکھ دیتے ہیں۔ لڑکا روتے روتے ہنسنے لگتا ہے اور دوڑتے دوڑتے گھر پہنچتا ہے اور چلا چلا کر کہتا ہے۔ ''اماں میں پاس ہوگیا، اماں میں پاس ہوگیا۔''

کارگہِ شیشہ گری

ہم نے جب الٰہ آباد یو پی بورڈ سے 1954 میں ہائی اسکول کا امتحان سائنس مضامین کے ساتھ تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا تو اس پر ہم بالکل پشیمان نہیں تھے بلکہ ہمیں حیرت تھی کہ آخر ہم پاس کیسے ہوگئے۔ ہماری غیر متوقع کامیابی کا جشن بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا گیا۔ پورے محلّے میں خالص گھی کے بنے ہوئے بوندی کے خوشبودار لڈّو تقسیم کیے گئے۔ ہماری ماں نے البرٹ ٹیلرز شہرت یافتہ پارچہ تراش کو گھر بُلا کرتا کید کی کہ ہمارے لیے کالی سرج کی شیروانی علی گڑھ کٹ پیجامہ اور بوسکی کی قمیض فوری تیار کی جائے۔

نئے کپڑے پہن کر ہم ابّا کے ساتھ یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہوئے تو امّاں نے ہماری نذر اُتاری پیشانی پر کالا ٹیکا لگایا، اُنگلیاں چٹخا کر دونوں ہاتھوں سے بلیّاں لیں۔ جھولیاں بھر بھر کے دعائیں دیں اور دروازے تک ہمیں رُخصت کرنے آئیں۔ یہاں ہم بتاتے چلیں کہ ان دنوں ہر شخص اپنے بچّوں کو انجینئر یا ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا۔ سو ہمارے ابّا بھی آرزومند تھے کہ ہم انجینئر یا پھر ڈاکٹر بنیں۔ جب کہ ہم حساب اور سائنس میں نہایت کمزور تھے۔ میتھ میں ہمیں دو نمبر کا گریس (Grace) ملا تھا اور سائنس میں ایک نمبر کا۔ ڈویژن ہم بتلا چکے ہیں۔ یعنی رائل ڈویژن میں بس حاشیے پر پاس ہوگئے تھے۔ داخلے کے وقت نہ تحریری امتحان لیا گیا اور نہ انٹرویو کی رسم نبھائی گئی اور ہمیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا طالب علم ہونے کا شرف و امتیاز حاصل ہوگیا۔

پہلے ہی سال ہمیں یونیورسٹی کی ایسی ہوا لگ گئی کہ نئے دوستوں کے ساتھ بیشتر وقت کیفے ڈی پھوس اور شمشاد مارکیٹ کے چائے خانوں میں گذرنے لگا۔ وہاں سے فرصت پاتے تو سلطان جہاں منزل کی لائبریری جا بیٹھتے اور قصے کہانیوں کی کتابوں میں

دل لگائے رہتے۔ شام ہوتی تو این آر ایس سی کلب جا کر بیڈمنٹن کھیلتے۔ کبھی کبھی جمنازیم نکل جاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حاضریاں کم ہوگئیں اور ہمیں امتحان میں شرکت کی اجازت نہیں دی گئی اور یوں بھی ہم میتھ میں صفر تھے۔ تھوڑی بہت بوٹنی (علم نباتات) جان گئے تھے اور ہم مولی کو ریڈش (Redish) اور شلغم کو ٹرنپ (Turnip) کہنے لگے تھے۔ کیمسٹری کے کچھ فارمولے بھی یاد ہوگئے تھے۔ مگر فزکس میں (law of gragvitation) نظریہ کشش ثقل سے آگے نہ بڑھ سکے۔ علم الحیوانات بس ہم اتنا جانتے تھے کہ انسان اور حیوان کی شرشت اور بناوٹ میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ سبق پروفیسر بصیر احمد خان نے پڑھایا تھا جسے ہم کبھی نہ بھولے۔ کیمسٹری کے شعبے میں کیپٹن حمید خان صاحب اور شہاب صاحب تھے جو ہمارے خمیر وضمیر کے اداشناس ہی نہیں ہماری شخصیت کے اجزائے ترکیبی سے بھی کماحقہ واقف تھے۔ ڈاکٹر بابر مرزا نے ہمیں حیوان سے انسان بنایا۔ دُبلے پتلے گورے چٹے منحنی سے پروفیسر سرتاپا انگریز، ان کے رعب داب کا یہ عالم تھا کہ ہماری روح فنا ہوتی تھی۔ شیروانی کے بٹن کھلے ہوں تو وہ کلمے کی اُنگلی اُٹھا دیتے اور ہمیں آسمان شق ہونے کا محاورہ یاد آجاتا۔ ہمارے اساتذہ میں اے آر قدوائی بھی شامل تھے ہم سائنس چھوڑ کر آرٹس میں آگئے تھے اور ان سے اکثر شرف باریابی حاصل ہوتا رہتا تھا کہ وہ پراکٹر کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے۔ یہ جامعہ کے پڑھے ہوئے تھے اور ذاکر صاحب کے مُنہ چڑھے تھے۔ جن دنوں ہم بی۔ اے میں تھے یہ اکثر حضرت پطرس کی سائیکل پر یونیورسٹی کے حدوداربعہ میں کھڑکھڑاتے پھرتے تھے۔ ہمارا بیشتر وقت اسٹوڈنٹس یونین کی سیاست میں گذرتا گیا۔ اشتیاق عابدی، قاضی جمال الدین، بصیر احمد خان وغیرہ ہماری سپورٹ (Support) پر یونین میں منتخب ہو کر آئے تھے۔ ہم افسانہ لکھتے تھے اور خود بھی افسانہ بن چکے تھے۔ ''نصرت'' کراچی میں ہمارا خاکہ (Caricature) اُڑایا گیا۔ منحنی خطوط میں ہماری شبیہ اُتاری گئی تھی اور ہمارے ایک ہاتھ میں چاقو اور دوسرے ہاتھ میں قلم دکھایا گیا تھا۔ بغرض اصلاح قدوائی صاحب نے ہمیں دس دن کے لیے یونیورسٹی سے خارج کردیا۔ ہمارا سینٹ ڈاؤن (Sent down) کردیا گیا تھا۔ پروفیسر اُمرالدین (فلسفہ کے اُستاد) جو الغزالی پر اتھارٹی مانے جاتے تھے

ہمارے استاد اور Dean faculty of arts بھی تھے ان کے حضور میں جا ہم نقشِ فریادی بن گئے۔ پہلے تو انہوں نے خوب جم کر کھری کھوٹی سنائیں اور پھر قدوائی صاحب سے بھی بات کی کہ ان کے ذہین ترین طالب علم کو سزا دینے سے پہلے انہیں اعتماد میں لیا جانا چاہئے تھا اور یوں سینٹ ڈاؤن کا عذاب ہمارے سر سے ٹلا۔

ابرار مصطفٰے صاحب شعبہ نباتات سے وابستہ تھے صوم وصلوٰۃ کے سخت پابند کہ ان کی جبین نیاز میں ہزاروں سجدے تڑپتے رہتے۔ بے حد خوش طبع اور خوش مزاج۔ میں نے انہیں جب بھی دیکھا خنداں بہ لب دیکھا۔ جمعہ کی نماز وہ یونیورسٹی کی مسجد میں پڑھتے تھے۔ ان سے برابر ملاقات رہتی تھی۔ نماز شروع ہونے سے پہلے ڈانٹ کے نئے نئے بہانہ ڈھونڈتے رہتے۔ خوش بختوں کو ہلکی پھلکی گالی سے بھی نوازتے۔ اُلو اور گدھا ان کے لغت میں محبت کے لفظ تھے۔ ابے تبے سے بات کرتے۔ رُکوع اور سجدے میں کوئی جلدی کرتا تو کہنی سے ٹھونگا مارتے۔ مرحوم نماز میں بھی مُسکراتے رہتے تھے۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں، پتہ نہیں اس میں بھی کیا رمز چھپا ہوا تھا۔ زندگی پھر علی گڑھ سے محبت کرتے رہے اور وہیں کی خاک میں رُل مِل گئے۔ رشید احمد صدیقی کے بعد علی گڑھ کے سب سے بڑے عاشق شاید پروفیسر ابرار مصطفٰے ہی تھے۔ حق مغفرت کرے۔ پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔ علی گڑھ کا قصہ طولانی ہے۔ خدا نے مہلت دی تو اس نگارخانے کے ہمہ صفت کرداروں سے پھر روبرو ہوں گے۔ زندگی ہے تو کہانی بھی ہوگی۔

✪✪✪✪

بے نظمی سے زندگی میں کیا نقصان ہوا اس کا حساب کتاب کرنے کی ہمیں کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم حساب میں ہمیشہ کمزور رہے اور آج بھی ہیں۔ ہاں فائدے ضرور گنوا سکتے ہیں کہ بے نظمی بھی بے سبب نہیں ہوتی اور اس کا اپنا ایک الگ مزہ اور ذائقہ ہے۔ تعلیم میں ہم نے حد درجہ کی لاپروائی برتی اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہم فزکس، کیمسٹری، میتھ، بوٹنی، زولوجی جیسے مضامین سے بہرہ ور ہوئے۔ مہارت تو کیا حاصل ہوتی مگر مبادیات سے ضرور واقف ہوگئے اور فخریہ کہنے

لگے کہ ہم سائنس اور اس کی نس نس سے واقف ہیں اور پھر ان مضامین پر اگر ہماری کلی گرفت ہوجاتی تو ہم ڈاکٹر یا انجینئر بن کر لوگوں کا زیاں ہی کرتے۔ ڈاکٹر ہوتے تو مرض کی تشخیص کرنے کے بجائے مریض سے بھاری فیس وصول کر کے اُسے وقت سے پہلے جنت یا جہنم پہنچا دیتے۔ جیسا کہ ڈاکٹروں کا آج کل عام چلن ہے۔ انجینئر ہوتے تو رشوت ستانی کے نئے ریکارڈ قائم کرنے کے چکّر میں جیل کی ہوا کھاتے۔ بچ نکلتے تو کروڑ پتی ہوجاتے۔ کبھی رہزن کے ڈر سے اور کبھی سی بی آئی کی ریڈ (Raid) کے خوف سے بلڈ پریشر، شوگر اور پیرانائڈ کے مریض ہوجاتے۔ خدا جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔ سائنس نے ہم سے مُنہ موڑا تو ہم نے لائبریری سائنس کے شعبے میں قسمت آزمائی کی وہاں کے نظم و ضبط سے جی گھبرایا تو ہم نے سیدھے آرٹس فیکلٹی میں پناہ لی۔ بی۔اے ۳رسالہ ڈگری کورس میں داخلہ مل گیا۔ سیاسیات، نفسیات اور ادبیاتِ اُردو ہمارے مضامین ٹھہرے۔ سیاسیات کے مطالعے سے ہمیں پتہ چلا کہ سیاستداں کا بنیادی فریضہَ احسن جنگ کے لیے فضا ہموار کرنا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو دو عظیم جنگیں کیوں لڑی جاتیں۔ ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم کیوں داغے جاتے۔ نفسیات پڑھ کر ہم نفسیاتی بیماریوں سے اتنے آشنا ہوئے کہ شیزوفرینیا کے شکار ہوکر خود کو بہت بڑا ادیب شہیر سمجھنے لگے۔ لباس وہ اختیار کیا کہ سرکس والے ہمیں جوکر سمجھ کر پکڑ لے گئے ہوتے۔ بندوق کی نال جیسے پائینچوں والی اٹنگی کالی پتلون، سُرخ قمیض، پیلی ٹائی اور نیلا رومال ہماری شناخت بن گئے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اُردو ادب سے رسم وراہ نے ہمیں صراطِ مستقیم دکھادی اور ہمیں اچھے چال چلن کا سرٹیفکٹ مل گیا۔

نفسیات کا فلسفہ یا فلسفی کی نفسیات ہم نے پروفیسر اُمرالدین سے سیکھی۔ سیاسیات کا پہلا سبق ہمیں پروفیسر حقی نے دیا، ان کی معرفت سوفاکلز، افلاطون، ارسطو، بینتھم (Bentham) ہابس لاک، روسو، میکاولی گرین، مارکس، برٹرینڈرسل وغیرہ کے ساتھ خوب خوب مکالمہ رہا۔ اُردو ادب کی رسالداری حاصل کرنے کے لیے ہمارا بیشتر وقت لٹن لائبریری اور سلطان جہاں منزل کے دارالمطالعہ میں گذرتا۔ فیض کا ''زنداں نامہ''

اور ''دستِ صبا'' ہماری آنکھوں کا سُرمہ بن گئے۔

قاضی عبدالغفار کے ''لیلیٰ کے خطوط'' اور ''تین پیسے کی چھوکری'' مفت میں ہاتھ آئے۔ ''الف لیلا اور ''شاہنامہ'' کی ضخیم جلدیں ہم نے بغیر سمجھے پڑھ ڈالیں۔ ''طلسم ہوش رُبا'' ہم پچھلے چالیس پینتالیس سال سے پڑھ رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ سلسلہ مرتے دم تک برقرار رہے گا۔ تشنہ کامی ہے کہ مٹنے کا نام نہیں لیتی۔ یہاں ہمیں شمس الرحمٰن فاروقی کی قسمت پر رشک آتا ہے۔ موصوف پوری امیر حمزہ ہضم کر گئے اور ڈکار تک نہ لی شاید اسی لئے وہ اپنے علاوہ ہر نقاد کو جاہل مطلق سمجھتے ہیں۔ یہاں مراد ان کے ہم عصروں بلکہ ان کے ہم عصر رقیبوں سے ہے۔ جن میں گوپی چند نارنگ پیش پیش ہیں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو بیچ میں آ گیا۔ یوں تو ہمیں اپنی ہیچمدانی کا اعتراف ہے کہ اس طرح منکسرالمزاجی کے اظہار سے لوگ آپ کے ساتھ ہمدردانہ سلوک روا رکھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ناموری یا بدنامی کی خاطر ہم نے داستان دردِ دل کے اظہار کے لیے فسانہ گوئی کی اُنگلی تھام لی تھی۔ کچھ افسانوں کے عنوانات ملاحظہ فرمایئے۔ ''یہ بجھی بجھی سی شمعیں''، آنسو اور آہیں، بجھتے چراغ، دل پر خوں کی گلابی''۔ ہماری حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا جب ہماری زندگی کا رومان رسائل و جرائد میں جگہ پانے لگا، ان دنوں ہم کل وقتی افسانہ نگار تھے۔ جو بھی رسالہ نظر آتا ایک افسانہ ٹانک دیتے۔ یوں ہم دھیرے دھیرے مشہور ہونے لگے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے جو ہمارے استاد بھی تھے ہماری پیٹھ ٹھونکی اور صالح مشورہ دیا کہ عادل رشید، ایم اسلم اور کرشن چندر سے خود کو آزاد کرلیں اور میکسم گورکی، چیخف، ٹالسٹائی، چارلس ڈکنس وغیرہ کو پڑھیں ورنہ ہم ادب میں کبھی نہ بخشے جائیں گے۔ ادبی جنون خیزی کے اسی دور میں مصاحب علی خان قمر رئیس سے ملاقات ہوئی۔ ہم ان کے پند و نصائح سے زیادہ ان کی آواز پر عاشق ہو گئے۔ ہم پر ایسی وجد آفریں کیفیت طاری ہوئی کہ ہم یہ شعر بار بار پڑھتے تھے اور سر دھنتے تھے

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

قمر رئیس ان دنوں پریم چند پر کام کر رہے تھے۔ ان کے نگراں پروفیسر رشید احمد صدیقی تھے۔ وہ شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ اس حقیر و فقیر کو بھی ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔

رشید صاحب پڑھتے وقت زیر لب تبسم سے آگے نہ بڑھتے، آہستہ روی سے بات کرتے، بڑے اہتمام سے زعفرانی پان نوشِ جاں فرماتے۔ بٹوا اور زردے کی ڈبیا ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی۔ ڈلی، الائچی، لونگ، احمد حسین دلدار حسین کا زردہ، زعفران کی ایک دو پتیاں، لیجئے پان کی گلوری تیار ہے۔ ادھر مُنہ میں ڈالا اُدھر گھل گئی۔ کلاس میں ایک دن ہمارے جی میں کیا آئی کہ ہم نے اپنی تازہ تحریر ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ جب وہ اس پر نظر ڈال چکے تو ہم نے دست بستہ عرض کیا۔ ''ہم کیسا لکھتے ہیں''۔ رشید صاحب نے پان کی گلوری مُنہ میں ڈالی اور اطمینان سے بولے۔ ''میاں آپ خوش خط ہیں''۔ جملے کے رمز کو ہم برسوں بعد سمجھ پائے۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ ہم ہمایں نہ شمایں۔ اب ایسے گنج ہائے گراں مایہ کہاں پایئے، جن کی جوہر شناس نگاہوں نے ابواللیث صدیقی، نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر محمد عزیر، اکبر حسین قریشی، خورشید الاسلام، خلیل الرحمٰن اعظمی، قمر رئیس اور قاضی عبدالستار جیسے دُرِ شہوار ڈھونڈ نکالے۔ نالائقوں میں ہم اپنا نام شامل کئے لیتے ہیں کہ یہ بھی ہمارے لیے وجہ امتیاز و افتخار ہے۔

رشید صاحب، آل احمد سرور کو شعبۂ اردو میں لے آئے تھے۔ ہر دو حضرات کو اسٹوڈنٹس یونین کے ساتھ گہرا شغف تھا۔ یونین کے کسی جلسہ میں رشید صاحب تقریر کر رہے تھے کہ اس دوران وہ کسی شعر کا حوالہ دینا چاہتے تھے، شعر ان کی یاد داشت سے محو ہو گیا تو انہوں نے اس کا مفہوم بیان کر کے کام چلا لیا۔ سرور صاحب اگلی صف میں موجود تھے۔ وہ اجازت طلب کر کے ڈائس پر گئے اور انہوں نے شعر پڑھ دیا۔ شعر سُن کر رشید صاحب نے زیر لب تبسم کے ساتھ فرمایا۔ ''میاں، سرور کو شعر یاد رہتا ہے اور ہمیں شعر کا مطلب''۔ یار زندہ صحبت باقی! ابھی بس اتنا ہی۔

✪✪✪✪

فضا

ہمارے زمانے میں علی گڑھ میں روایات کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ آکسفورڈ کی طرح علی گڑھ یونیورسٹی کے کچھ کنوینشنز (Conventions) تھے جن پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر سینئرز جونیئرز کی روایت تھی۔ جونیئر پر لازم تھا کہ وہ اپنے سینئرز کے ساتھ پورے احترام اور عزّت کے ساتھ پیش آئے۔ سینئرز بھی اپنے جونیئرز کی پوری نگہداشت رکھتے تھے۔ ایسے ہی ہمارے ایک سینئر تھے تپن بھائی۔ دُبلے پتلے منحنی سے، پھونک ماریئے تو اُڑ جائیں۔ وہ راحت کدہ میں ڈگی روڈ پر رہتے تھے۔ ہماری ''غیر تعلیمی سرگرمیوں'' پر انکش لگانے کے لیے انہوں نے ہمیں شہر سے بلا کر اپنی کوٹھی راحت کدہ میں جگہ دے دی۔ ہم بی اے کے دوسرے سال میں تھے اور ایک سال حاضریاں کم ہونے کی بنا پر امتحان میں بیٹھنے سے روک دیے گئے تھے۔ تپن بھائی کی نگرانی میں ہم باقاعدگی سے کلاسیں اٹینڈ کرنے لگے۔ باقاعدگی سے آزاد لائبریری جانے لگے۔ تپن بھائی نے ہمیں انگریزی اخبار پڑھنے کی عادت بھی ڈالی۔

ہمیں یاد ہے ان دنوں انڈین ایکسپریس اخبار کے ایڈیٹر مشہور زمانہ صحافی (Dom Morris) تھے جہاں ہم سے غلطی ہوتی تپن بھائی نہ صرف ہمارا تلفظ درست کرتے ہمیں معنی بھی بتلاتے جاتے۔ صبح کی چائے اور دو توس ہمارا ناشتہ مقرر تھا۔ تپن بھائی چارمینار سگریٹ پیتے تھے۔ غصّہ آتا تو ان کا سانولا چہرہ سُرخ ہو جاتا اور وہ ناک سے دھواں نکالتے ہوئے گہری نظروں سے ہمیں دیکھتے۔ یوں تو ہم نہایت تنومند مضبوط اور لمبے چوڑے تھے مگر اپنے سینئر تپن بھائی کی سرزنش پر سر جھکائے مجرم کی طرح خاموش کھڑے رہتے۔ تپن بھائی کو کلاس اٹینڈ کرتے ہم نے بہت کم دیکھا۔ ان کا بیشتر وقت یونین کی سیاست میں گذرتا۔ بلیئرڈ کے وہ عاشق تھے۔ دو تین گھنٹے بلیئرڈ کھیلنا ان کا شوق

نہیں بلکہ جنون تھا۔ ان کے علاوہ ہمارے کچھ اور بھی سینئر تھے جن میں بزل بھائی، حشو بھائی، راغب بھائی اور توصیف بھائی ہمیں خوب یاد ہیں، رام پور کے شریف خان بھی ہمارے سینئر تھے۔ کیفے ڈی لیلیٰ یا پھر پیراڈائز ریستوران شمشاد مارکیٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہم نظر ڈالتے، اگر کسی سینئر کو دیکھ لیتے تو سگریٹ بجھا کر خاموشی سے کسی میز پر جا بیٹھتے۔ چائے پی کر جب کاؤنٹر پر بل ادا کرنے جاتے تو پتہ چلتا کہ ہمارا بل ادا کردیا گیا ہے۔ سینئرز کے لیے بل کی ادائیگی تو معمولی بات تھی۔ وہ اپنے جونیئرز کی پڑھائی لکھائی پر پورا دھیان دیتے۔ ان کا ہال ٹکٹ لا کر دیتے۔ فیس کم پڑ جاتی تو اس کی ادائیگی کی ذمہ داری کو اپنے سر اُٹھا لیتے۔ پیپر خراب ہو جائے تو نمبر بڑھوانے کے لیے ایگزامنر (Examiner) کے یہاں چکر لگاتے نظر آتے۔

جن دنوں ہم بی اے کر رہے تھے۔ قائم گنج کے صفی خان جو ڈاکٹر ذاکر حسین کے عزیزوں میں تھے۔ اپنے چھوٹے بھائی عرفان کو لے کر ہمارے پاس آئے جس کا پری یونیورسٹی آرٹس میں داخلہ ہوا تھا۔ اور یہ کہہ کر ہمارے حوالے کردیا کہ آج سے اس کی پڑھائی لکھائی کی ذمہ داری آپ کی ہوئی ہم سے کوئی مطلب نہیں۔ ہم نے یہ ذمہ داری قبول کرلی کہ اب ہم ان کے سینئر تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوئے۔ عرفان پڑھ لکھ گئے۔ صفی خان اور عرفان خان دونوں بھائی پٹھانوں کی روایتی خصوصیات سے مرصع تھے۔ ہم سے شدید محبت کرتے تھے اور سائے کی طرح ہمارے ساتھ لگے رہتے تھے۔ ایک دن ہم اپنے بے تکلف دوست سلطان سلیم احمد خان کے ساتھ ڈگی روڈ پر واقع ایک چائے خانے میں بیٹھے مزے مزے کی باتیں کر رہے تھے۔ سلیم والیان ٹونک میں سے تھے نہایت خوبرو سُرخ سپید مہذب نوجوان، ان کے حُسن طرح دار کا یہ عالم تھا کہ گرلز کالج کی عالم میں انتخاب دوشیزائیں ان کے عشق میں ٹھنڈی آہیں بھرتی تھیں۔ اتفاق سے دونوں بھائی صفی اور عرفان ہمیں تلاش کرتے ہوئے چائے خانے میں آ گئے۔ ہم نے ان کے لیے چائے منگوائی۔ وہ لوگ خاموشی کے ساتھ چائے پیتے رہے۔ سلیم ترنگ میں تھے اور یوں بھی ہماری ان سے بے تکلفی تھی اِن کے

مُنہ سے کوئی جملۂ معترضہ نکل گیا۔ ہم نے تو کوئی دھیان نہیں دیا۔ صفی کے ابروخم آلود ہوگئے۔ انہوں نے قہر آمیز نظروں سے سلیم کو دیکھااور کرسی سے اُٹھ کر باز کی طرح جھپٹے۔ ہماری چھٹی حِس نے کام کیااور ہم درمیان میں آکر ہائیں ہائیں کرنے لگے۔ ورنہ سلیم صاحب پِٹ چکے ہوتے۔ صفی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ہم نے سختی کے ساتھ انہیں کرسی پر بیٹھنے کی تاکید کی۔ غصّے سے ان کا چہرہ سُرخ ہورہا تھا جسے وہ ضبط کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ وہ حواس میں آئے تو عرفان خان سلیم کی طرف لپکے۔ ہم نے نہایت غصّے سے انہیں جھٹک کر کہا۔ ''آخر یہ طوفان بدتمیزی برپا کیوں کیا جارہاہے۔ ہوا کیا ہے؟''۔

دونوں بھائیوں نے خون کا گھونٹ پیتے ہوئے رسان سے کہا۔ ''فیاض بھائی ہمارے سامنے کوئی آدمی آپ سے اتنی بے تکلفی سے پیش نہیں آسکتا، جو آپ کے لیے کسر شان ہو''۔

بے چارے سلیم نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے معذرت کی بلکہ گڑگڑا کر معافی مانگی تب جاکے ان کی جان چھوٹی۔ آج بھی ہمیں یہ واقعہ یاد آتا ہے تو بے اختیار ہنسنے لگتے ہیں۔ برسوں بعد سلیم سے ملاقات ہوئی اور ہم نے اس واقعہ کا ذکر کیا تو وہ ہاتھ جوڑ کر بولے۔ بھائی پٹھانوں سے خدا بچائے۔ اور یہ مصرعہ گنگنانے لگے ''ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو''۔

✪✪✪✪

یونین کے انتخابات کا اپنا ایک الگ لطف تھا۔ وائس پریزیڈینٹ کے لئے ہمارے دوست تصور زبیری نے اپنی امیدواری کا اعلان کردیا۔ اسلامیات کے جید عالم علیم صاحب کے صاحبزادے حلیم ان کے مدّ مقابل تھے۔ ان کے علاوہ ایک غیر مسلم جاٹ لڑکا بھی پورے طمطراق کے ساتھ انتخاب کے میدان میں اُترا تھا۔ یونین الیکشن میں امیدواروں کے سپورٹر اینٹی (Anti) شائع کرتے تھے جس میں اپنے امیدواروں کی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے اور مخالف کی خامیوں کی طرف لطیف اشارے

ہوتے تھے۔ حلیم مرحوم کے طرفداروں میں قیصر حیات تھے۔ چونکہ انتخاب سہ طرفہ تھا۔ ہم نے حلیم اور ان کے رفیقوں کو اپنے کیمپ میں دعوت دی تا کہ انتخاب کو سہ طرفہ ہونے سے بچایا جا سکے اور تجویز یہ رکھی گئی کہ ہیڈ ٹیل کرلیا جائے۔ باہمی رضامندی کے بعد فضا میں سکہ اچھالنے کا فریضہ ہم نے ادا کیا اور اس کھیل میں تینوں بار ہم جیتے۔ گو کہ اس جیت میں ہماری چالاکی کام آئی تھی۔ حلیم میاں اور اُن کے ہمنواؤں سے ''حقوق دستبرداری'' کے میثاق پر دستخط کرائے گئے اور فوری طور پر اُس کی نقلیں تمام ہالوں (Halls) میں تقسیم کردی گئیں۔ حلیم میاں کو ہماری شاطرانہ چال کا علم ہوا تو انہوں نے تحریری طور پر اعلان کیا کہ ان کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے اور یہ کہ وہ انتخاب میں ڈٹے رہیں گے۔ ادھر غیر مسلم امیدوار کے ہمنواؤں نے انتخاب کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا۔ انتخاب کا نتیجہ نکلا۔ تصور زبیری فاتح قرار دیے گئے۔ روایت کے مطابق شکست خوردہ امیدوار کا جنازہ نکالا گیا۔ اقبال سنگھ جو فرقہ وارانہ خطوط پر انتخاب لڑ رہے تھے انہوں نے یونیورسٹی میں شوریدگی پھیلا دی۔ عارضی طور سے تعلیمی فضا متاثر ہوئی، شہر میں بھی تناؤ پیدا ہوگیا جس نے فساد کی صورت اختیار کرلی۔ کاش اس سے گریز اختیار کیا جاتا۔ قابل تعریف بات یہ ہے کہ یونیورسٹی کے طلبا نے یگانگت اور محبت کا ماحول قائم رکھا اور یونیورسٹی کے ایک بھی غیر مسلم طالب علم کو گزند نہیں پہنچائی گئی۔ یونیورسٹی میں اقامت پذیر ہندو طالب علم ہر طرح سے محفوظ رہے۔ خصوصی طور پر اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستہ طالب علموں نے فضا کو معمول پر لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں کنور پال سنگھ، مقصود، تصوّر زبیری اور رضا امام کے نام پیش پیش ہیں۔ کنور پال سنگھ بعد میں شعبہ ہندی سے وابستہ ہوگئے۔ پروفیسر اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے عہدہ جلیلہ سے سرفراز ہوکر سبکدوش ہوئے۔ رضا امام انگریزی شعبہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ تصور زبیری انگلینڈ چلے گئے۔ مدرسی ان کا پیشہ رہا۔

✪✪✪✪

وہ بھی کیا دن تھے۔ ادھر نمائش کی تاریخوں کا اعلان ہوا اُدھر یونیورسٹی طلباء کا قافلہ

سج دھج کر روانہ ہوا۔ باقاعدہ یونیورسٹی پراکٹوریل آفس کیمپ قائم کیا جاتا تھا۔ تنبوؤں اور قناطوں کا رواج تھا۔ جہاں میز کرسی، صوفہ سبھی کچھ ہوتا تھا۔ یونیورسٹی کے بُلز (Bulls) کی ڈیوٹی لگتی تھی۔ سینئر پروکٹوریل مانیٹر اور مانیٹرز کی فوج ظفر یاب کے ساتھ کالی شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنے ہمارے پراکٹر مختار صاحب کا بارہ دری سے گذر ہوتا تھا۔ شیروانی کے بغیر کوئی طالب علم نظر میں آجاتا تو فوری طور پر اس کا اعمال نامہ مرتب کیا جاتا سرزنش کے طور پر جرمانہ عائد کیا جاتا اور سختی کے ساتھ تلقین کی جاتی کہ آئندہ وہ کبھی یونیفارم کے بغیر نمائش گاہ میں دیکھے گئے تو یونیورسٹی سے ان کا عارضی اخراج کردیا جائے گا۔ مختار صاحب گورے چٹے پورے قد کے ذی شان اور ذی وقار شخص تھے۔ ان کی شناخت اتاترک پاشا کی آخری نشانی ترکی ٹوپی سے ہوتی تھی جو بھیڑ میں دور سے نظر آجاتی تھی۔ ان کی سرخ ترکی ٹوپی دیکھتے ہی طالب علموں کی سٹی گم ہوجاتی اور وہ یوں تتر بتر ہوجاتے گویا کوئی مرکھنے سانڈ صاحب بن بلائے محفل نشاط کو درہم برہم کرنے آ پہنچے ہوں۔ نظم وضبط کا عالم یہ تھا کہ ہنسنے میں بھی احتیاط لازم تھی۔

نمائش میں سینٹرل ہوٹل سہارن پور کے کباب پراٹھے دعوت اشتہا دیتے نظر آتے۔ بدایوں کے پیڑوں کی بھی بڑی شہرت تھی۔ محمد ہاشم بریلی کے سرمے والے کی دوکان پر خریداروں کا جم غفیر رہتا۔ قنوج سے عطریات کے سوداگر شمامہ، جنت الفردوس، کشید گلاب اور چنبیلی کے علاوہ خس، عنبر اور مشک کے تحفے لے کر آتے اور خوشبوؤں کا قافلہ خمار آلود خوابوں کی طربناک دنیا میں لے جاتا۔ نظارہ پر بھلا کس نے پہرے بٹھائے ہیں۔ خوبانِ کالج کی عشوہ طرازیاں عاشقوں کے دل پر بجلی بن کے گرتیں۔ ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے دھیمی آواز میں کوئی مصرعہ اُٹھاتا اور کوئی سرپھرا جواب الجواب دوسرا مصرعہ پڑھ دیتا

''نیم جاں کئی ہوں گے کئی بے جان ہوں گے''

بہرطور بدن اور روح کی تہذیب کا خیال رکھا جاتا۔ علی گڑھ کے مشاعرے کو امتیاز حاصل تھا۔ دربار ہال میں بڑے طمطراق کے ساتھ بزم شعروسخن کا اہتمام کیا جاتا تھا۔

مقامی شاعر کباب صاحب، جاذب صاحب اور محمود آفندی صاحب میزبان کے فرائض انجام دیتے۔ اس تاریخی مشاعرے میں ہم نے جگر مرادآبادی کو غزل خواں دیکھا، یہیں ہمیں ناطق گلاؤٹھی، جوش ملیح آبادی، جگن ناتھ آزاد، پنڈت ہری چند اختر، روش صدیقی، فراق گورکھپوری، سلام مچھلی شہری، خمار بارہ بنکوی، رفعت سروش کے نیاز حاصل ہوئے۔ جذبی، مجاز اور کیفی بھی اس بزم سخنوراں میں چاند ستاروں کی طرح چمکے، سردار جعفری کی شرکت تو بہرطور لازم تھی۔ میکش اکبرآبادی، نشور واحدی، ساغر نظامی، بکل اتساہی، فنا نظامی کانپوری، نذیر بنارسی، راز الٰہ آبادی، دل شاہجہانپوری، گلزار دہلوی، ساحر لدھیانوی، صبا افغانی کے نام بھی اس تاریخی مشاعرے کی شناخت بن گئے تھے۔ خواتین کی نشست کا اہتمام اسٹیج کے پیچھے کیا جاتا تھا۔ ان دنوں چقیں چلمن کا کام دیتی تھیں۔ گویا پردے کا انتظام و انصرام ہوجاتا۔ بھئی ایک شعر سن لیجئے (ناموزوں ہوتو موزوں کرلیجئے کیونکہ ہمیں نہ شعر یاد رہتے ہیں نہ شعر کا مطلب)

کیسا پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

لو بھئی کیسے نادان ہیں علامہ انور صابری کو بھولے جا رہے تھے۔ کالج کے لڑکے ان کی شاعری کے دیوانے اور وہ خود لڑکوں کے عاشق تھے۔ اردو کی شعری روایت فارسی سے مستعار ہے۔ امید ہے کہ ہمارے مافی الضمیر سے آپ آشنا ہوں گے۔ نہ ہوئے ہوں تو غور فرمائیں۔ میر جس کے سبب بیمار ہوئے وہ معشوق طرحدار مونث تھا کہ مذکر۔ سرگشتۂ خمار ادب تہذیب کے دائرے میں خوب چٹکیاں لیتے۔ بھبتیاں کستے۔ داد و بیداد کا ایسا سماں بندھتا کہ رات دبے پاؤں گذر جاتی اور پتہ بھی نہ چلتا۔ مشاعروں کی تہذیب اور شاعروں کی تکذیب کے لیے پس یہ لازم تھا کہ شاعر "ٹوپی نشیں" ہو ورنہ پورا ہال ٹوپی ٹوپی کے پنچم سے گونج اُٹھتا۔ اس میں برا بھی کیا تھا۔ لڑکے ٹوپی پہناتے تھے اُتارتے نہیں تھے۔

نمائش گاہ میں ہائے ہائے کا بازار بھی تھا جہاں قیامت کا شور برپا رہتا تھا۔ یونیورسٹی

کے لڑکے ادھر جانے سے گریز کرتے۔ بھیڑ بھی غضب کی رہتی تھی کھوے سے کھوا چھِلتا۔ عام طور سے دیہاتیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ یہ بازارِ یوسف تو تھا نہیں۔ یہاں تو کھاجے کی دوکانیں لگتی تھی اور بے اختیار وہ ضرب المثل یاد آتی تھی۔

اندھیر نگری چوپٹ راجا۔۔۔ ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا۔

اسی بازار کے بغل میں ریمن سرکس لگتا تھا۔ ہاتھی، شیر اور بندروں کے کرتب دیکھنے بھی لوگ جاتے ہوں گے مگر یونیورسٹی کے ہم جیسے معصوم لڑکے تو سنولائے ہوئے حسن بے پرواہ کو خود بین اور خود آرا کرنے کے لیے حاضر کوئے جاناں ہوتے تھے۔ چڈی بنیان میں ملبوس یا پھر نا ملبوس سرکس خواتین کا نظارہ کرنے کی سعادت پہلے پہل ہمیں ریمن سرکس میں ہوئی۔ اب تو یہ نظارہ عام ہے۔ شہر کی کسی بھی شاہرہ پر نکل جایئے۔ شوق نظارہ اور دیدہ حیران کے باہمی ربط کی نازک آفرینیاں واضح ہوتی چلی جائیں گی اور یہ بھی کہ اب آپ اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں۔

علی گڑھ کی نمائش کی سوغاتوں میں نوٹنکی بھی شامل ہے۔ اس کی تہذیب و تاریخ پر نظر ڈالنے کے لیے آپ کو اک ذرا پیچھے کی طرف دوڑنا ہوگا۔ فلموں کے ورودِ مسعود سے قبل ہندوستان کے چھوٹے بڑے شہروں میں پارسی تھیٹر کا دبدبہ قائم تھا۔ تھیٹر کے ساتھ پارسی کا لفظ اس لیے نتھی ہے کہ ان تھیٹروں کے مالک پارسی ہوتے تھے۔ ساز اور آواز کے امتزاج کے ساتھ ساتھ پارسی تھیٹر میں ایسے قصّے پیش کیے جاتے تھے جن میں لباس کی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔ روشنی اور اندھیرے سے بھی تاثر کی لے تیز کی جاتی تھی، موسیقی کے سازوں میں کھال کے ساز جیسے نقارہ، ڈھولک اور طبلہ وغیرہ کے زیر و بم سے کہانی اور مکالموں کی فضا بنائی جاتی تھی۔ منظوم مکالموں کی آرائش و زیبائش سے مرکزی نقطۂ نظر کو پیش کرتے وقت تصادم اور کشاکش کے عناصر پر زور صرف کیا جاتا تھا۔ ہلکے پھلکے سامعین کی تفریح طبع کے پیش نظر مکالموں کی زبان آسان ہوتی تھی۔ ہیرو، ہیروئن اور ویلین کے علاوہ ایک مزاحیہ کردار کی شمولیت ضروری سمجھی جاتی تھی جو ''سوتر دھار'' یا راوی کا رول بھی ادا کرتا تھا اور بیچ بیچ میں اپنی ذومعنی گفتگو سے سامعین کو ہنساتا تھا اور

انہیں غور وفکر کی دعوت بھی دیتا تھا۔ اصل میں یہ کردار زوال آمادہ قدروں پر اُچٹتی ہوئی تنقید کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا اور زہر ہلاہل کو قند کی صورت میں پیش کرتا۔

✪✪✪✪

قمر رئیس سے جب ہماری ملاقات ہوئی تو وہ ستائیس برس کے نہایت خوبرو نوجوان تھے۔ اگر وہ ادب کی بھول بھلیاں میں نہ پھنستے تو یقینی طور پر فلموں کے کامیاب ہیرو ہوتے، ہم تو انہیں اردو ادب کا بھی ہیرو مانتے ہیں، ان دنوں وہ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر تھے۔ ہماری ان سے رسمی سی رسم وراہ تھی۔ بزعم خود ہم خود کو بڑا افسانہ نگار سمجھتے تھے۔ اردو کے مدیران کی یہ حماقت ہی تھی کہ ادھر ہم افسانہ بھیجتے اُدھر وہ چھپ کر آجاتا۔ ''صبا'' کے سلیمان اریب نے ہماری خاصی طویل کہانی ''اندھیرے کا پھول'' شائع کی تھی۔ ''نیا دور'' کے صباح الدین عمر اور ''شاعر'' کے اعجاز صدیقی نے بھی ہمیں چھاپ دیا تھا۔ ہماری ہمت افزائی میں پاکستانی رسائل بھی پیچھے نہیں تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان دنوں ہم کل وقتی افسانہ نگار تھے۔ ایک دن ہم پوچھ پاچھ کے بدر باغ جا پہنچے، قمر رئیس کرسی پر اکڑوں بیٹھے سگریٹ رول کر رہے تھے۔ کمرے میں چاروں طرف کتابیں اور رسائل بکھرے ہوئے تھے۔ اگر ہمیں ٹھیک یاد ہے تو وہاں ٹیگور کی تصویر بھی تھی۔ قمر صاحب بڑی محبت سے پیش آئے۔ خود اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلائی۔ ہماری تازہ کہانی ''بیگم رضیہ'' سُنی، ایک دو لفظ اپنے قلم سے گھٹائے بڑھائے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ان دنوں عارف مارہروی نے ناول نگاری شروع کردی تھی۔ ''یادوں کے سائے'' چھپ چکا تھا۔ غالباً دوسرے ناول ''تاریکیاں'' پر وہ قمر رئیس سے مقدمہ لکھوانا چاہتے تھے اور اس کے لیے انہیں ہماری سفارش کی ضرورت تھی۔ ہم فوراً تیار ہوگئے اور بغیر کسی پیشگی اطلاع کے ان کے یہاں جادھمکے۔ بہت خوش ہوئے۔ ناول کا مسودہ رکھ لیا۔ اور پڑھ کر نہایت عمدہ مقدمہ لکھ کر دیا۔ نئے لوگوں کو آگے بڑھانا اور ان کی ہمت افزائی کرنا ہمیشہ سے ان کا مزاج رہا ہے۔ (ان کی اس کمزوری سے بعض لوگوں نے ناجائز فائدہ بھی اُٹھایا)

ہم جب بھی شمشاد مارکیٹ جاتے قمر رئیس کے یہاں چکر ضرور لگاتے۔ ان دنوں وہ میگزین کی ادارت میں الجھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہم سے افسانہ طلب نہیں کیا اور ہمیں بھی میگزین کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔ پھر بھی ہم اس کی اشاعت کے بے چینی سے منتظر تھے۔

میگزین دیکھ کر آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی۔ خصوصی طور پر امیر شرر کا ڈرامہ ''آخری پدمنی'' پڑھ کر ہم سر دھننے پر مجبور ہو گئے۔ ان دنوں قاضی عبدالستار کوئی مشہور آدمی نہیں تھے۔ انہوں نے ایک ناول ''شکست آرزو'' لکھا ضرور تھا جو لکھنؤ کے کسی اشاعتی ادارے نے شائع کیا تھا۔ مگر یہ ناول مشہور نہیں ہوا تھا۔ قاضی صاحب شاعری بھی کرتے تھے اور مزے کی شاعری کرتے تھے۔ اردو میگزین میں ان کی نظم شامل تھی۔ جس کا ایک مصرعہ مجھے آج بھی یاد ہے۔

وفا اتار رہی ہے سرِ بزم پشواز

بعد میں انہوں نے شاعری ترک کر دی اور غیر معمولی ناولٹ ''مجو بھیا'' لکھ کر ادب میں اپنی دھاک جمالی۔ ''دھرم یگ'' میں دھرم ویر بھارتی نے ان کی کئی کہانیاں شائع کیں اور ہندی والے انہیں عہد جدید کا پریم چند کہنے لگے۔ وہ اپنے ناول ''شب گزیدہ'' اور ''داراشکوہ'' کے لیے یاد رکھے جائیں گے، یوں تو ان کے افسانے ''رضو باجی، پیتل کا گھنٹہ، مالکن، میراث'' وغیرہ ادب میں زندہ جاوید ہو چکے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ طرز نگارش کے اعتبار سے قاضی عبدالستار کا کوئی ثانی نہیں، قاضی صاحب اور قمر رئیس ایک دوسرے کے قلب وجگر ہیں۔ قاضی صاحب کے سامنے مجال ہے کہ کوئی زور سے ہنس سکے، حد یہ ہے کہ وہ مسکراتے بھی احتیاط سے ہیں مگر قمر صاحب کے ساتھ میں نے انہیں قہقہہ بردوش دیکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی دوسری شادی کے ایک وکیل قمر صاحب بھی تھے۔ ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ: بحیثیت ناول نگار'' ان کا پہلا تحقیقی کام ہے جس کی آج بھی بڑی اہمیت ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ''تلاش و توازن'' کے نام سے ہمارے دوست انور کمل حسینی اور اُن کے برادرِ نسبتی نے 1968 میں دلی سے شائع کیا

اور تبصرے کے لیے ایک نسخہ ہمیں بھی عطا کیا۔ ہم نے ایمانداری سے تبصرے کا حق ادا کیا اور یہ بھول گئے کہ قمر رئیس ہمارے دوست اور استاد بھی ہیں۔ بے لاگ تبصرے کی یہ ادا ہم نے ان سے ہی سیکھی تھی۔

جن دنوں قمر رئیس ''ادیب''، علی گڑھ کے مدیر تھے یعنی ۵۷۔۵۸ء میں انہوں نے ہم سے آغا حشر کاشمیری پر مضمون لکھوایا۔ اُس کی نوک پلک سنواری اور ''ادیب'' میں شائع کر دیا۔ اسی زمانے میں یہ مضمون صہبا لکھنوی نے اپنے وقیع رسالے ''افکار'' کراچی میں شائع کیا۔ یاد پڑتا ہے کہ پریم چند کے بعض ہندی مضامین بھی ہم سے اردو میں ترجمہ کرا کے ''ادیب'' میں شائع کیے تھے۔ یوں ہم ان کی رہنمائی میں ترجمے کے فن سے آشنا ہوئے۔ غالباً ''نگارشاتِ ادب'' میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے آغا حشر والا ہمارا لکھا مضمون شامل کر کے ہمیں ممنونِ کرم بھی کیا تھا۔

یہ ہم اپنا ذکر کہاں لے بیٹھے۔ معذرت خواہ ہیں۔ بات قمر رئیس کی ہو رہی تھی۔ بدر باغ کے مختصر کمرے کو ہم نے ہمیشہ نغمہ بار دیکھا، یہاں احمد جمال پاشا، حسن مثنی، انور صدیقی، عثمان غنی، امیر شرر، بلدیو مرزا، امین اشرف، شاہد مہدی اکثر دیکھنے میں آتے تھے۔ خیال آتا ہے کہ حامد الہ آبادی سے بھی یہیں ملاقات ہوئی تھی جو روسی ادب پھیری لگا کر فروخت کرتے تھے۔ انہیں شاعری سے بھی شغف تھا۔ ان کی مختصر سی شعری کتاب ''شعلۂ نے'' شائع ہو چکی تھی۔ جسے ادبی حلقوں میں خاصہ پسند کیا گیا تھا۔ خصوصاً ڈاکٹر محمد حسن، خلیل الرحمٰن اعظمی اور معین احسن جذبی کے علاوہ اعجاز عسکری نے نہایت عمدہ تبصرہ کیا تھا۔ امین اشرف بھی تھے۔ جاوید کمال بھی تھے۔ جن کی لائبریری کینٹین میں اکثر جذبی صاحب اور راہی معصوم رضا دیکھے جاتے تھے۔ اخلاق محمد خان شہریار ایم۔اے کر رہے تھے۔ ابھی مشہور نہیں ہوئے تھے اور خلیل صاحب کے حوالے سے جانے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شروع شروع میں انہیں خلیل صاحب لکھ کر دیتے تھے۔ بعد میں انہوں نے اپنی الگ راہ نکالی۔ جس کی تصدیق ان کے ابتدائی شعری مجموعے ''اسم اعظم'' سے ہوتی ہے۔ بنیادی طور پر وہ حزن و ملال کو اپنی شعری زندگی کا استعارہ

قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن شعبۂ اردو میں لیکچرار تھے۔ ''زلفیں اور زنجیریں'' ناولٹ لکھ کر مشہور ہو چکے تھے۔ میں انہیں اسی حوالے سے جانتا تھا۔ ان کی مختصر سی تنقیدی کتاب ''ادبی تنقید'' نے بھی ہمیں متاثر کیا تھا۔ رومانوی تحریک پر ان کا کتابچہ بھی نظر سے گزر کر دل میں جگہ بنا چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو ڈرامے سے بھی خصوصی لگاؤ تھا۔ آل انڈیا ریڈیو پر ان کے ڈرامے نشر ہو کر مقبول ہو چکے تھے۔ ''پیسہ اور پرچھائیں'' کی تو آج تک دھوم ہے۔ انہوں نے علی گڑھ میں تھیٹر کی بنیاد ڈالی تھی اور گوگول کے ڈرامے ''انسپکٹر جنرل'' کو اردو کے قالب میں ڈھالا تھا۔ یونیورسٹی یوتھ فیسٹول کے لیے یہ ڈرامہ تیار کیا گیا جو دلی میں منعقد ہونے جا رہا تھا۔ قمر صاحب اس کی ریہرسل میں ایک ناظر کی حیثیت سے شریک رہتے۔ تمام کردار طے شدہ تھے۔ قمر صاحب نے انسپکٹر جنرل کے معاون کا کردار مسیتا بیگ اختراع کیا اور اس کے مکالمے لکھ کر انہیں حفظ کر لیا۔ اس کی سچویشن بھی طے کر لی اور ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اپنے اختراع کیے ہوئے کردار کے مکالمے انہیں پیش کر دیئے۔ ڈاکٹر صاحب اسکرپٹ پڑھ کر اتنے متاثر ہوئے کہ مسیتا بیگ کا یہ کردار گوگول کے ڈرامے میں شامل کر لیا اور قمر صاحب نے مسیتا بیگ کے مزاحیہ کردار کو اپنی انوٹھی پیشکش سے لافانی بنا دیا۔ انہوں نے عمدہ اداکاری کا مظاہرہ کر کے ناظرین کو خوب خوب ہنسایا۔ تو یہ تھا آواز کا جادو جو لوگوں کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔

قمر صاحب کو شعر گوئی کا چسکا لڑکپن میں ہی لگ چکا تھا۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں غزل کہنے لگے تھے۔ بعد میں نظموں کی طرف مائل ہوئے۔ اپنے بڑے بھائی مبارک شمیم سے اصلاح لیتے تھے۔ طوفانی اور بلاخیز عشق ان کی شاعری کا محرک تھا۔ ہمیں قمر صاحب نے اپنی ابتدائی شاعری کے تراشے دکھائے۔ شعاعیں دہلی، جمالستان دہلی، جھلک علی گڑھ میں ابتدائی کلام شائع ہوا۔ بعد میں شاعر، شاہراہ، قومی آواز، پگڈنڈی امرتسر اور شیرازہ کراچی میں غزلیں اور نظمیں تواتر سے شائع ہوتی رہیں۔ فیض اور جذبی سے متاثر تھے۔ مگر محض نغمہ ریزی کی حد تک!

علی گڑھ میگزین ۱۹۵۷ء میں ہم نے ان کی پہلی نظم ''شب چراغ'' پڑھی تھی۔ اس کا آخری بند پیش ہے۔

پھر وہی سوچ کہ جینے کے بہانے کیا ہوں
پھر وہی فکر کہ کب تک غمِ رسوائی ہے
دل پُر خون بھی وہی ہے وہی اہرامِ وفا
پھر وہی کنج قفس پھر وہی تنہائی ہے

قمر صاحب کو ۱۹۵۹ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ خواجہ احمد فاروقی کی گوہر شناس نظروں نے شعبہ اردو دلی یونیورسٹی کے لیے انہیں بطور لیکچرار منتخب کر لیا۔ افسانوں کی ترسیل کے لیے ہمارا دلی آنا جانا رہتا تھا۔ ہم نے قمر صاحب کو پرانی دلی میں ڈھونڈ نکالا اور مبارک باد دینے کے لیے ان کے گھر پہنچ گئے۔ ہماری خوب ضیافت ہوئی۔ اسے خوبیٔ قسمت ہی کہیے کہ اتفاقی طور سے ایم اے کرنے کے لیے ہمیں آصف علی میموریل اسکالرشپ مل گیا اور ہمیں با قاعدہ ان کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ایم۔ اے میں ہماری فرسٹ ڈویژن آئی۔ اردو افسانے کے ارتقاء پر ہم نے پی ایچ ڈی کا کام ان کی نگرانی میں شروع کیا۔ یو جی سی فیلوشپ بھی ملا۔ مگر ہم ایک چیپٹر سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ہماری مرحوم تھیس کا یہ باب ''اردو افسانے کا پس منظر۔ مغرب و مشرق کے حوالے سے'' شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر نہ ہونے پر ہم بالکل ناخوش نہیں۔ نہ ہم اس کے لئے پشیمان ہیں۔ آج جسے دیکھیے دربغل پی ایچ ڈی کی ڈگری دبائے افتاں و خیزاں نظر آتا ہے اور اردو بے چاری پشیمان ہوتی ہے کہ کیسے کیسے نابغۂ روزگار اس کی مٹی پلید کر رہے ہیں۔ خدا ایسے سبھی ڈاکٹروں پر رحم فرمائے۔ ان کی عاقبت تو سنور نے سے رہی ان کی املا اور انشا ہی سنوار دے۔ آمین۔

باقی کی حکایت لذیذ اگلی صحبت کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں۔

✪✪✪✪

ظہیر الدین علوی جامعہ اردو کے رجسٹرار تھے۔ شام کو یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں

ادیب، ادیبِ ماہر اور ادیبِ کامل کی شبینہ کلاسیں ہوتی تھیں۔ڈاکٹر تنویر علوی، محمود الٰہی زخمی اور مرحوم نسیم قریشی اعزازی طور پر درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔نسیم قریشی خوش ادا خوش خلق اور خوش لباس تھے، نزاکت و صباحت ان کی ہشت پہلو شخصیت کا جزوِ لازم تھی۔ غنچہ دہن ایسے کہ بلبل کو بھی رشک آئے، گلفشانی گفتار کا یہ عالم کہ لفظوں کی خوشبو سے فضا مشک بار ہو جاتی۔حسن و عشق کی حکایتِ لذیذ یوں بیان کرتے تھے کہ بے اختیار غالب کا مصرع یاد آجاتا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

سلیمان ہال میں رہتے تھے۔ وظیفہ یاب ہونے تک نقل مکانی کا خیال تک نہ آیا۔ لڑکے ان کے عاشق اور وہ ان کے محبوب تھے۔شام کو نشست کا اہتمام ہوتا۔ ان کے شاگردوں میں خاصے ذکا اور فہیم شامل تھے۔انور صدیقی، امین اشرف، کبیر احمد جائسی اور میکش بدایونی کے علاوہ شمسی طہرانی بھی قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنے چلے آتے۔ ادب، سیاست، معاشرت، منافرت، رقابت، تصوف، تشخص، تعشق غرض کہ دنیا جہان کے موضوعات بحث و تمحیص کے دائرے میں سمٹتے، سکڑتے نصف شب کا اعلان کرتے اور محفل کا اختتام ہوتا۔نسیم صاحب کو چائے کا فنجان اور پان کی گلوریاں بے حد عزیز تھیں اور ارغوانی چائے کے جرعے یوں زیر گلو کرتے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی گلابی چائے یاد آجاتی۔ پان کی گلویاں چاندی کے ورق میں لپٹی زعفران اور قوام کا جادو جگاتی ہونٹوں سے اٹھکیلیاں کرتی رہتیں۔علی گڑھ کی تہذیبی روایتوں کے اسیر نسیم صاحب اگلے وقتوں کی شرافتوں کے آخری نقیب تھے۔سرزمین کول سے ان کے عشق کی یہ انتہا ہی تو تھی کہ مرکز حسن کو انھوں نے اپنا مرقد بنالیا۔ یونیورسٹی کے شہر خموشاں سے گزرتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ سفید بُراق شیروانی زیب تن کیے مُنہ میں گلوری دبائے پشت کی جانب ہاتھ باندھے نسیم صاحب کا سایہ محوِ خرام ہے۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کیا خوب شخص تھے۔

اب آیئے کچھ اور پری وشوں کا ذکر ہو جائے۔تنویر علوی ہمارے بے حد شفیق استاد

رہے ہیں۔ ذوق کے قصائد پڑھانے میں انہیں یدطولیٰ حاصل تھا۔ ادیب ماہر میں جب ہم نے داخلہ لیا تو تنویر صاحب عنفوانِ شباب کی منزلوں سے گزر رہے تھے۔ نوخیزی اور نوجوانی کا عالم طرارے بھر رہا تھا۔ ان کے یہاں ایک عجیب قلندرانہ شان پائی جاتی تھی۔ یوں تو وہ صوفی وصافی آدمی تھے۔ قناعت ان کا شیوہ تھا۔ مگر پڑھاتے وقت ان پر جذب وکشش کی غیر معمولی کیفیت طاری ہوجاتی۔ خوش ادا اور خوش قبا اور شیریں دہن طالبات بھی ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھیں۔ کبھی کبھی تنویر علوی صاحب شعر کا مطلب پوچھتے اور مطلب براری سے یوں خوش ہوتے گویا قارون کا گمشدہ خزانہ ہاتھ آگیا ہو۔ اپنے شاگردوں کو تذکیر وتانیث کی قید سے ماورا ہمیشہ ''میری جان'' کہہ کر مخاطب کرتے۔ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمیں ان جیسا ذکی الحس اور نادر روزگار فہیم وعقیل استاد نصیب ہوا۔ یہ ان کے اعجاز خطابت کا فیض ہے کہ لفظوں کی انجمن کے راز ہائے دروں سے آشنائی کے ساتھ ہم صنم آشنا ہونے کا بھی دعوا کرنے لگے۔

قبلہ خواجہ احمد فاروقی ڈاکٹر علوی کو دلّی لے اُڑے جہاں ان کی صلاحیتوں نے چوکھا رنگ اختیار کرلیا اور گراں قدر کتابوں کی تخلیق، تہذیب وترتیب کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کا فریضہ احسن ادا کرتے رہے۔ انہیں ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی پرواہ، شعبہ کی سیاست سے اپنا دامن ہمیشہ پاک رکھا، جلوت سے زیادہ خلوت کے آدمی تھے۔ گوشہ نشینی اور قناعت پسندی ان کا شیوہ رہا۔ دلّی یونیورسٹی میں چالیس برس تک علم و ادب کی خدمت میں تن من دھن سے مصروف رہے اور بڑی خاموشی سے پروفیسر ہوئے بغیر ریٹائر ہوگئے۔ پرانی دلّی کے گنجان آبادی والے علاقے چوڑی والان میں ان کا قیام ہے۔ ان کا گھر غالب کی حویلی سے زیادہ دور نہیں۔ اس قرب کے ناطے وہ غالب کے پڑوسی ٹھہرے۔ حق ہمسائیگی کے طور پر انہوں نے غالب کی فارسی نظموں کو اردو قالب عطا کیا۔ غالب کے فارسی مکتوبات کی روشنی میں ان کا زندگی نامہ مرتب کیا۔ اردو کی شعری روایت پر اپنے غیر معمولی کام کے لیے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

ابھی یہ کالم زیر تحریر تھا کہ انگریزی اخبار ''ٹریبون'' میں ہم نے اپنے شفیق استاد

ڈاکٹر تنویر کا پروفائل دیکھا۔ بین السطور میں یہ اطلاع بھی شامل تھی کہ ڈاکٹر صاحب کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں دلّی اردو اکیڈمی نے آپ کو بہادر شاہ ظفر ایوارڈ سے سرفراز کیا ہے۔ دیر سے ہی سہی ارباب حل وعقد نے ان کی غیر معمولی ادبی کاوشوں کا اعتراف تو کیا۔

محمود الٰہی کو تو یاد بھی نہ ہوگا کہ ہم ان کے جز وقتی شاگرد رہ چکے ہیں۔ زخمی صاحب بڑی دلدہی اور بڑی سرخوشی کے ساتھ مکتب عشق کا سبق پڑھاتے تھے۔ پان کی گلوری سے ہونٹوں پر شفق رنگ بکھرائے پورے انہماک اور استغراق کے ساتھ فتنہ پرور محبوب کی عشوہ طرازیوں کے اظہار و بیان میں زمین و آسمان ایک کر دیتے۔

معنی و مفاہیم کی شش جہات دنیا کی خود بھی سیر کرتے اور طلباء کو بھی ''سیر گل'' کی رمزیت و اشاریت سے یوں گزارتے کہ مزہ آجاتا۔ کبھی کبھی ہم لوگوں کے اصرار پر اپنا کلام بھی سناتے اور خود بھی فرمائش کرتے۔ ان دنوں ہمارے ایک نوجوان ساتھی امانت اللہ جو قدرے سینئر تھے۔ ایسی سوز بھری آواز میں غزل خواں ہوتے کہ ستم ظریف طالبات نمدیدہ ہوجاتیں اور ہم موقع غنیمت جان بیداد کی داد دے کر بندۂ ستم ایجاد کہلاتے۔ ادھر محمود الٰہی زخمی ہماری ''ناصائب'' حرکتوں پر زیر لب تبسّم کرتے رہتے۔ علی گڑھ سے پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد زخمی صاحب رضا کالج رام پور چلے گئے۔ بعد میں لیکچرار کی حیثیت سے ان کا تقرر گورکھپور یونیورسٹی میں ہوگیا۔ ریڈر اور پروفیسر ہوئے۔ اتر پردیش اکادمی کے چیئرمین بھی رہے۔ انہوں نے شاعری ضرور ترک کردی مگر پان کھانا نہیں چھوڑا۔ پان اب بھی کھاتے ہیں۔ بلکہ پان ان کا ٹریڈ مارک ہے، یقین ہے کہ اگر انہوں نے کبھی کوئی پارٹی بنائی تو اُس کا نشان پان ہوگا۔ یوں تو زخمی صاحب نے کئی نامور شاگرد پیدا کیے جو پروفیسر کے عہدہ جلیلہ تک پہنچے۔ مگر یہاں ان کے ایک شاگرد مرحوم ڈاکٹر فضل الحق کا ذکر مقصود ہے۔ جو دلّی یونیورسٹی میں ہمارے استاد تھے۔ شاکرؔ، ناجیؔ، آبروؔ اور حاتمؔ کے نام ہم نے پہلی بار ان کے دہن مبارک سے سُنے اور یہ بھی متقدمین استاذ لااساتذہ تھے۔ ہمیں صدق دل سے اعتراف

ہے کہ ہم نے ان اساتذہ کے کلامِ بلاغت نظام کو بالکل نہیں سمجھا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ جدید شاعروں کا کلام سننے کے بعد ہم یہ ضرور کہنے لگے۔ ابہام اور اہمال سے بچیئے کہ یہ استادوں کا حق ہے۔ جدیدیوں اور نو جدیدیوں کا نہیں۔ سمع خراشی کے لیے معذرت! ہم مشاہدہ حق کی بات کرتے ہیں، ناحق کے پھیر میں نہیں پڑتے۔ حق تو یہ ہے کہ ہمارے استاد ڈاکٹر فضل الحق نہایت دوست دار اور کشادہ دل انسان تھے۔ اپنے غریب الوطن شاگردوں کی شکم پُری کے لیے وہ پہلے انہیں یونیورسٹی کیفے میں لے جاتے۔ چائے کے ساتھ وائے بھی نوشِ جان کراتے اور خوب قہقہے لگاتے، ہمیں جب ضرورت ہوتی ہم ان کی جیب میں سیندھ لگاتے تھے اور وہ خوش ہوتے تھے۔ اکثر ہمیں قرض حسنہ بھی دیتے تھے۔ پڑھاتے کم تھے۔ ہنستے مسکراتے اور قہقہے زیادہ لگاتے تھے۔ پاس ادب کا خیال رکھتے ہوئے ہم لوگ ان سے ہلکا پھلکا مذاق بھی کر لیتے تھے۔ جس کا انہوں نے کبھی بھی بُرا نہیں مانا۔ بس ہنس دیتے تھے۔ آج اڑتیس چالیس سال بعد بھی ان کا ہنستا ہوا سانولا سلونا چہرہ یاد آتا ہے تو ہم ایک ٹھنڈی آہ بھر لیتے ہیں۔ پروفیسر ہو گئے تھے۔ کسی ناقابل تشخیص عارضے میں ایسے مبتلا ہوئے کہ ہنستے ہنستے ایک دن ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ خدا بخشے بڑی خوبیوں والے انسان تھے۔ تحصیل علم کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہتے لیکن ہمیں ایسا ہنسنا سکھایا کہ ہم ہنستے ہنستے رونے لگتے ہیں۔ حق مغفرت کرے۔ اب ایسے دیدہ ور کہاں!

ہائے کمبخت تونے پی ہی نہیں

مولانا شوکت علی کے رسالے ''اولڈ بوائے' ' علی گڑھ کے کسی شمارہ میں جو 1925 کے بعد شائع ہوا، رشید احمد صدیقی کا علی گڑھ کالج پر 1915 مابعد عنوان سے وقیع مضمون موجود ہے۔ جو ان کے کسی انتخاب میں شامل نہیں۔ اپنے مضمون کی تمہید میں اس کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔

''اب تو لوگ پاس ہونے اور ڈگریاں لینے کے خیال سے آتے ہیں۔ اُس وقت انسان بننے اور بنانے کے لیے آتے تھے۔ لوگوں کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی تھی کہ ڈگری ملی یا نہیں۔ خیال اس کا رہتا تھا کہ زندگی کے ہر معرکے میں، جانبازوں کی ہر صف میں علی گڑھ والے کا ہی نام اُچھلا یا نہیں۔ بعض لوگ پکار اُٹھیں گے گذرا ہوا زمانہ حال سے زیادہ خوش گوار معلوم ہوتا ہے۔ ایسوں کا جواب خاموشی ہے۔ داغؔ نے شاید اسی موقع کے لیے کہا۔

''ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں''

اس تمہید کی اس لیے ضرورت پیش آئی کہ ماضی کی صورت گری منظور و مشہود تھی کہ اس کے بغیر خیال کی تعبیریں تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ نصف صدی قبل جب ہم نے دانش گہہ علم و ادب میں قدم رکھا تو تہذیب کے چراغ روشن تھے اساتذہ اپنے طالب علموں کو دور سے پہچان لیتے تھے۔ ہمیں خوب یاد ہے کہ فزکس کی کلاس میں ہمارا پہلا دن تھا۔ فضل صاحب نے حاصری کے بعد فرداً فرداً ہمارا اور ہمارے تعلیمی پس منظر کا جائزہ لیا۔ ہم شہر سے آئے تھے اور یوپی بورڈ کے تھرڈ ڈویژن تھے اور ابھی چودہ برس کے نہیں ہوئے تھے۔ فضل صاحب کے استفسار پر جب ہم نے اپنی تعلیمی لیاقت کا انکشاف کیا تو ان کے ہونٹوں پر استہزا آمیز مسکراہٹ آئی۔ جس کا مطلب و مفہوم ہم

بہت بعد میں سمجھ پائے۔

فزکس کے شعبے میں پروفیسر گل صدارت کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے۔ گورے چٹے ایسے کہ ان پر انگریز ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ ظل الرحمٰن نئے نئے لیکچرار ہوئے تھے۔ ہنستے زیادہ تھے پڑھاتے کم تھے۔ ہاکی کے شوقین تھے۔ اکثر پیجامے کے پائینچے چڑھائے ہاکی کے میدان میں لڑکوں سے پہلے پہنچ جاتے اور پورے میدان میں اکیلے گیند کے تعاقب میں پسینہ پسینہ ہوتے رہتے۔

کیمسٹری میں شہاب صاحب CH4 کا فارمولہ سمجھاتے رہے اور ہم نہ سمجھے۔ یہ اپنے صاحبزادے ظفر اقبال کی وجہ سے زیادہ جانے جاتے ہیں۔ جو انڈین ہاکی ٹیم کے کپتان اور کوچ رہے۔ ایک آفتاب صاحب بھی تھے بالکل نوجوان بلکہ نوخیز بڑے بھائی کی طرح ہم لوگوں کو ''ایام جہالت'' کی تاریکیوں سے باہر نکالنے کی کوشش میں ''بلیک بورڈ'' کو چاک سے سپیدی میں بدلتے رہتے۔ مگر ہماری عقل پر جو سیاہ پردہ پڑا ہوا تھا وہ بدستور پڑا رہا۔ کیپٹن حمید خان صاحب بھی شعبۂ کیمیا میں ریڈر تھے ایک زمانے میں ہمارے پراکٹر بھی رہے۔ پان کے شوقین تھے۔ بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے مگر رعب داب کا یہ عالم تھا کہ لڑکے کنّی کترا کے نکل جاتے۔ اخلاق الرحمٰن قدوائی صاحب بھی تھے، ذاکر صاحب کے چہیتے شاگرد، جامعہ کے تربیت یافتہ۔ علی گڑھ آئے تو سرتاپا علیگ ہو گئے اور علی گڑھ والوں کو ہمیشہ یاد رکھا۔ پارلیمنٹ کے ممبر رہے، بہار کے گورنر ہوئے آج کل ہریانہ ریاست کے مالک و مختار ہیں۔ یعنی ہز ہائینس ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی، جن دنوں یونین پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین تھے اور اندرا گاندھی کی کوٹھی کے برابر والی کوٹھی میں فروکش تھے ان سے بات ہوتی رہتی تھی۔ کاش! ہم نے ان سے بالمشافہ ملاقات کرلی ہوتی تو ڈائریکٹر جنرل ہو گئے ہوتے مگر ہم پکے علیگ تھے اور رعایت اور سفارش کے سزاوار کیوں ہوتے۔ ہمارے لیے تو ان کی محبت بھری ہوئی نیک خواہشات ہی بہت تھیں۔

قدوائی صاحب کے علاوہ ذاکر صاحب کے ایک اور چہیتے شاگرد تھے، شعبہ ہندی

کے صدر اور این آر ایس سی (بی) کے پرووسٹ پروفیسر ہربنس لعل شرما جو علی گڑھ یونیورسٹی کے عارضی وائس چانسلر ہوئے۔ گاندھیائی مزاج کے آدمی تھے۔ بوٹا ساقد، سفید ٹوپی، چوڑی دار پیجامہ اور شیروانی۔ زندگی بھر ان کی شخصیت کا لازمہ قرار پائی۔ جب تک ہم یونیورسٹی میں رہے ہر برس پرووسٹ فنڈ سے ہمیں نقد پچیس روپے عنایت کرتے رہے۔

پروفیسر ستیش چندرا کو بھلا کون فراموش کرسکتا ہے۔ تاریخ کے مایۂ ناز اسکالر، یونیورسٹی میں ریڈر تھے پراکٹر کی ذمہ داریاں بھی نبھاتے تھے۔ اکثر ہم سزایاب ہونے کے لیے ان کے سامنے پیش ہوتے رہتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ہمیں ہم سے زیادہ جانتے اور سمجھتے تھے۔ بعد میں ترقی کرکے پروفیسر ہوئے اور یو جی سی کے چیئرمین بھی بنے۔ ڈاکٹر رئیس احمد فزکس کے شعبے میں تھے۔ ہم اپنے بھانجے کے ایڈمیشن کے سلسلے میں ان سے ملے، انہوں نے خوش دلی سے فرمایا ''میاں گاڑی دلّی پہنچ چکی ہے اور آپ ٹکٹ مانگ رہے ہیں۔ داخلے تو ہو چکے مجبوری ہے''۔ ہم نے برجستہ کہا ''ڈاکٹر صاحب آپ بجا فرماتے ہیں۔ مودبانہ عرض ہے کہ گاڑی واپس آچکی ہے اور ویٹنگ میں ٹکٹ مل سکتا ہے۔ ہم انتظار کرلیں گے''۔ ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر ہماری حاضر جوابی کی داد دی اور لڑکے کو ویٹ لسٹ میں ڈال دیا۔ اس طور اس کا داخلہ ہو گیا۔

✪✪✪✪

ذاکر صاحب کا خیال آتا ہے تو ذہن میں چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ ہم نے انہیں تقسیم اسناد کے جلسے میں لفظوں کے زرد جواہر لٹاتے دیکھا تھا۔ گویا نطق ان کی زبان کے بوسے لے رہا تھا۔ جملوں کی نفاست اور شائستگی سماعت کے دریچوں میں نسیم صبح گاہی کے مانند اٹھکھیلیاں کر رہی تھی۔ خطابت کا جادو وہ سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ صوت وحرف کا ایسا طلسم معنی خیز کہ ہم بُت کے مانند انہیں تکا کئے۔ ہم کیا سبھی ان کی لذتِ تقریر کے سحر میں کھو چکے تھے۔

ذاکر صاحب ساری عمر سماجی اور تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے جامعہ ملیہ اسلامیہ

جیسے عظیم الشان ادارے کی تعمیر و تشکیل میں انہوں نے اپنی جان لڑادی، وہ اس قومی دانش گاہ کے بنیاد گزاروں میں تھے۔ چالیس روپے کے قلیل مشاہرے پر وہ برسوں اس درس گاہ کی آبیاری میں اپنا خونِ جگر صرف کرتے رہے۔ جرمنی سے پی ایچ ڈی کا اعزاز حاصل کرنے کے باوجود خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار ترجیحی طور پر وہ جامعہ ملیہ کے ساتھ برسوں وابستہ رہے۔

جس زمانے میں انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی باگ ڈور سنبھالی وہ بڑا پُر آشوب دور تھا۔ یونیورسٹی الزامات کے دائرے میں گھری ہوئی تھی۔ انتہاپسند قیادت سے وابستہ ظلمت پسندوں کا خیال تھا کہ پاکستان کے قیام کی تحریک میں یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد نے خصوصی کردار ادا کیا تھا۔ نیز یہ کہ یونیورسٹی مسلم لیگیوں کی پناہ گاہ بنی ہوئی تھی۔ گوبند ولبھ پنت، پرشوتم داس ٹنڈن، گھنشیام داس سیٹھ اردو کلچر اور اردو زبان کے سخت ترین مخالف ہو رہے تھے جبکہ روشن خیال پنڈت جواہر لعل نہرو، سرتیج بہادر سپرو، کیلاش ناتھ کاٹجو اور سردار بلدیو سنگھ وغیرہ گاندھی جی کی قیادت میں اپنی وسیع المشربی اور آزاد خیالی کی شمع روشن کیے ہوئے تھے، حالانکہ گنگا جمنی تہذیب اور مشترکہ کلچر کے پرستاروں پر دشنام طرازی کی لے تیز ہو رہی تھی۔ گاندھی جی نے جس مشترکہ زبان کے تصور کو ہندوستانی کے نام سے فروغ دینا چاہا تھا اسے انتہاپسندوں نے یکسر مسترد کردیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی، ذاکر حسین اور ڈاکٹر مختار انصاری نے ہزار الزام تراشیوں اور شدید مخالفتوں کے باوجود صبر کا دامن نہ چھوڑا اور اردو کلچر اور تہذیب کو سینے سے لگائے رہے۔

ذاکر صاحب نے ایک نئے عزم کے ساتھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو نہ صرف یکجا کیا بلکہ یونیورسٹی کی تعلیمی وتہذیبی زندگی میں اپنے عزم مصمم سے نشاۃ الثانیہ کا آغاز کیا اور اسے ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ پرانی رونقیں پھر لوٹ آئیں۔ اتحاد، اتفاق اور اشتراک کی قندیلوں سے دبستان علم و ادب روشن ہوتا چلا گیا اور ظلمت پسندوں کو شکستِ فاش ہوئی۔

ذاکر صاحب کے احوال و کوائف پر نظر ڈالیں تو یہ جان کر اطمینانِ قلبی ہوتا ہے کہ اصلی قائم گنجی پٹھان ہوتے ہوئے بھی انہوں نے خود کو (خان) کے لاحقے سے آزاد کرلیا تھا۔ وہ پرانی شرافتوں، نفاستوں اور نزاکتوں کے پیکر اعلیٰ تھے، ان کے اخلاق و انکسار کا یہ عالم تھا کہ ان کے دور اقتدار میں ''وائس چانسلر لاج'' لڑکوں کا گھر کہلاتی تھی وہ جب بھی جس وقت چاہیں اپنے مسائل اور دشواریوں کے ازالے کے لیے ان سے بالمشافہ ملاقات کرسکتے تھے۔ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کی تعلیمی و تہذیبی سرگرمیوں میں ان کی خصوصی دلچسپی تھی کیونکہ وہ خود بھی اپنے دورِ طالب علمی میں طلباء یونین کی سربراہی کرچکے تھے۔ایک موقع پر ذاکر صاحب وائس چانسلر تھے اور شوخ، چلبلے، بے حد طباع اور ذہین سعید انڈا یونین کے صدر کے عہدے پر فائز تھے۔ عاشورے کی تعطیل کا اعلان نہیں ہوا تھا، شہدائے کربلا کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے ماتم گساروں کی مجلس کا اہتمام کیا گیا۔ حاضرین مجلس میں ذاکر صاحب بھی شامل تھے۔ سعید انڈا نے رسمی کلمات کے ساتھ حاضرین جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے اپنی برجستہ تقریر کا آغاز کچھ اس طرح کیا۔

''محفل ماتم گساراں میں محترم و محتشم جناب ذاکر حسین کی شمولیت اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ شہدائے کربلا کی بے پناہ عظمت و جگر کاوی، شجاعت و حرمت ان کے دل گداز پر ایک لافانی نقش کی صورت میں مرتسم ہے اور پھر یہ تو خواب و خیال میں بھی ممکن نہیں کہ ذاکر حسین کے ہوتے ہوئے ذکر حسین نہ ہو''۔ جملے کی بلاغت اور فصاحت کو سمجھتے ہوئے تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے دوران ذاکر صاحب نے فوراً عاشورہ کی تعطیل کا اعلان کردیا۔

ذاکر صاحب اپنی سادہ لوحی، قناعت پسندی۔ خاندانی شرافت اور حمیت کے لیے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ وائس چانسلر کے بعد انہیں بہار کا گورنر بنادیا گیا۔علی گڑھ میں ان کی بھتیجی کی بارات پاکستان سے آئی تھی۔ میزبان کے فرائض ذاکر صاحب ادا کر رہے تھے۔ باراتی کھانا تناول فرمارہے تھے۔ ان کی انکساری کا یہ عالم تھا کہ مہمانوں کی

تواضع کے لیے وہ بہ نفسِ نفیس خود موجود تھے اور فرداً فرداً سب کی مزاج پُرسی کر رہے تھے۔ از راہِ اخلاق انہوں نے کسی مہمان سے نہایت شیریں لہجے میں کہا۔ ''میاں! کسی چیز کی ضرورت ہو تو فرمائیے میں حاضر ہوں''۔ پٹھان مہمان نے میٹھے چاولوں پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے سر اُٹھائے بغیر کہا ''ہاں پانی لے آیئے''۔ ذاکر صاحب نے اپنی برگزیدگی کا احساس کیے بغیر بڑی حلیمی کے ساتھ پانی کا گلاس مہمان کی خدمت میں پیش کر دیا۔

اب ایک اور واقعہ بھی سن لیجئے جس سے ذاکر صاحب کی وسیع القلبی، انسانیت نوازی، انصاف پروری اور دلدہی کا دل سے معترف ہونا پڑتا ہے۔ ہمارے یار مہربان اور محسن سیّد ابوالحسنات حقی ہمارے ساتھ دلّی یونیورسٹی سے ایم اے کر رہے تھے ان کے ایک نزدیکی رشتہ داران ان کی معیت میں ہمارے ہاسٹل جبلی ہال میں تشریف لائے اور ہمارے مہمان ٹھہرے۔ وہ نہایت پریشان اور فکرمند نظر آرہے تھے۔ ہمارے استفسار پر انہوں نے بتلایا کہ ان کے کسی عزیز کا جو ائیرفورس میں ملازم تھے کورٹ مارشل کر دیا گیا اور انہیں قید بامشقت کی سزا سنائی گئی ہے۔ ان کی محض اتنی خطا تھی کہ انہوں نے اپنے سینئر سے تیز لہجہ میں گفتگو کرنے کی گستاخی کی تھی۔ خطا بخشی کی مرسی اپیل (درخواست رحم) محض صدر جمہوریہ کے یہاں کی جاسکتی تھی جو صدر مملکت ہونے کے ناطے فوج کے سپریم کمانڈر بھی تھے۔ ہم نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ان کی ''مرسی اپیل'' ذاکر صاحب تک لے جانے کی ذمہ داری قبول کر لی اور فوری طور پر ان کی اپیل لے کر راشٹرپتی بھون پہنچے۔ ان کے عملے کو ہم نے بتلایا کہ ہم ڈاکٹر صاحب کے طالب علم ہیں اور ایک اپیل ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ صدر جمہوریہ کے سکریٹری حمید صاحب تھے وہ ہمارے ساتھ نہایت نرمی اور شفقت سے پیش آئے اور ہمیں یقین دلایا کہ ہمارے جملہ کاغذات صدر جمہوریہ کی خدمت میں ضرور پیش کر دیئے جائیں گے۔ ذاکر صاحب کہیں دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ ہم اپیل ان کے سکریٹری کے حوالے کر کے ہوسٹل آئے اور جلد ہی یہ واقع ہمارے ذہن سے محو ہو گیا۔

برسوں بعد ابوالحسنات سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی وہ ہمیں اپنے ایک معمر بزرگ کے یہاں ظہرانہ پر لے گئے۔ کھانے کے بعد میزبان نے زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دریافت فرمایا۔ ''فیاض صاحب آپ ہمیں پہچانے یا نہیں''۔

ہم انہیں واقعی نہیں پہچان سکے تھے۔ ہم نے انکسار کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا۔ ہمیں شش و پنج میں دیکھ کر انہوں نے اس راز سے پردہ اٹھایا۔ ''آج سے تیس سال قبل ہم فریادی کی صورت میں حاضر ہوئے تھے اور آپ کے ہوسٹل جبلی ہال میں آپ کے مہمان رہے تھے۔ اب کچھ یاد آیا''۔ خود فراموشی دور ہوتے ہی تیس سال پرانہ واقعہ آنکھوں کے سامنے روشن ہوتا چلا گیا اور ہم نے بڑی بے قراری اور اضطراب کے عالم میں دریافت کیا ''یہ تو فرمایئے اس مرسی اپیل کا فیصلہ آپ کے حق میں ہوا یا نہیں؟''

بزرگ نے اپنی ریش مبارک پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا ''الحمد اللہ آپ کی کوشش رنگ لائی، عزّت مآب صدر نے رحم کی درخواست منظور کر لی تھی اور ملزم کو نوکری پر بحال کر دیا گیا تھا۔ تو ایسے تھے ہمارے ذاکر صاحب۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

✪✪✪✪

شیروانی ہمارے قومی لباس کا حصّہ ہے ہم نے ڈاکٹر راجندر پرساد جیسے ہندوستان کے پہلے صدر مملکت سے لے کر وزیر اعظم نہرو تک سبھی قائدین کو شیروانی میں ملبوس دیکھا ہے۔ سرسیّد، ڈاکٹر سیّد محمود، سرراس مسعود، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر یوسف حسین خان، پروفیسر ابوبکر، پروفیسر میمن، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر رشید احمد صدیقی، کرنل بشیر حسین زیدی سبھی لوگ شیروانی زیب تن کرتے تھے اور اسے اپنے لیے باعثِ افتخار جانتے تھے۔ حدتو یہ ہے کہ بدرالدین طیب جی جیسے کروفر والے آئی سی ایس افسر جب مسلم یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ ہوئے تو انہوں نے بھی شیروانی اور ٹوپی کو اپنا لباس بنایا۔ کون نہیں جانتا کہ علی گڑھ کی نمائش کے زمانے میں لڑکے مشاعرے میں شعراء کو بھی ٹوپی پہنا دیتے تھے۔ اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔ کیمپس سے شیروانی بالکل غائب ہوگئی

ہے، موجودہ وائس چانسلر نسیم صاحب خود دو برس تک اس یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے ہیں۔ کاش وہ خود بھی اس روایت کی پابندی کریں اور اساتذہ سے بھی کرائیں اور لڑکوں سے بھی۔ شیروانی ہماری اس مادر درسگاہ کی پہچان اور شناخت ہے۔ اگر ہم نے اسے چھوڑا تو گریز کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اپنی میراث اپنی روایت اپنی تہذیب اور اپنے تشخص کو خود اپنے ہاتھوں سے مٹا رہے ہیں۔ میں جب پچھلی بار علی گڑھ آیا تھا تو پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر معین احسن جذبی سے ملاقات ہوئی تھی آج یہ دونوں ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ کیسے کیسے گہر نایاب تھے جو اَب نہیں رہے۔ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔ اب صرف پرانی یادیں باقی رہ گئیں ہیں۔

✪✪✪✪

شمشاد مارکیٹ میں ہمارے یونیورسٹی کے پرانے ساتھی کپتان اسد خاں ماشاء اللہ آج بھی خوب چونچال ہیں، ہمک کر بڑی محبت سے ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ الطاف حسین فریدی جرنلسٹ ہیں، سلمان رشدی کے حسب نسب اور علی گڑھ کے اوپر ان کا ایک مضمون اس وقت کے انگریزی ہفت روزہ ''کرنٹ'' (Current) میں شائع ہوا تھا جس کو مرحوم ایوب سیّد (علیگ) ممبئی سے شائع کرتے تھے۔ سیّد امین اشرف سے افسوس ہے کہ شرف ملاقات حاصل نہیں ہوسکا وہ غزل کی زلفیں سنوارنے میں مشغول رہتے ہیں۔ ایک اور ساتھی رضا امام انہیں بھی تلاش کیا مگر بے سود۔ میکش بدایونی کی بڑی یاد آئی جن کے دم قدم سے شعر و سخن کی محفلیں آباد تھیں اور جن کی شرافت اور وضع داری کی قسمیں کھائی جا سکتی تھیں وہ فارسی کے سابق صدر شعبہ پروفیسر ضیاء احمد کے صاحبزادے تھے وہ بھی خیال آباد سے عدم آباد کے سفر پر روانہ ہو چکے ہیں۔ اعزاز رسول کی بھی بہت یاد آئی جو ہمارے زمانے میں یونیورسٹی کی کلچرل کمیٹی کے سکریٹری تھے۔ انہوں نے انٹر یونیورسٹی ڈرامہ کمپٹیشن میں ہمارا ایک ڈرامہ منتخب کیا اور انعام کے طور ہمیں مولانا آزاد کی مشہور کتاب ''انڈیا وِنس فریڈم'' عطا کی تھی۔

ایک اور باغ و بہار شاعر و ادیب کی شخصیت کا ذکر بھی مقصود ہے جن کی یادوں

کے چراغ میرے دل میں آج بھی جل رہے ہیں۔ اختر انصاری اکثر بالائے قلعہ آتے تھے اور فاروق بھائی کے ہوٹل پر بیٹھ کر چائے پیتے تھے یہ اس وقت علی گڑھ کا ایک مشہور ہوٹل تھا۔ اختر انصاری کے ساتھ اکثر ان کے عزیز شاگرد نور العارفین اور جمنا پرساد راہی بھی ہوتے تھے۔ نور العارفین نے بی ایڈ کیا تھا اور اختر صاحب کی شاگردی کا امتیاز حاصل تھا۔ جمنا پرساد راہی ایک گھڑی ساز تھے اور مختار ہاشمی کے شاگرد لیکن ارادت مند اختر صاحب کے بھی تھے۔ وہ ان کی پوری تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ اختر صاحب کی ذاتی زندگی اس شعر کی تفسیر تھی۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

وہ آئی سی ایس افسر بننا چاہتے تھے۔ لندن بھی گئے تھے مگر حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ بی ٹی کرنے پر مجبور ہوگئے اور ترقی کرتے کرتے پہلے تو شعبۂ اردو میں ۱۹۴۳ء میں لیکچرار مقرر ہوسکے اور بعد کو یونیورسٹی کے ٹریننگ کالج میں استاد ہوئے جہاں انہوں نے بی ایڈ اور ایم ایڈ کے طلبہ کو پڑھایا۔ وہ اردو میں فرسٹ کلاس ایم اے تھے۔ ان کی زندگی کے معمولات بڑے عجیب وغریب تھے دنیا سے نرالے دیر سے گیارہ بجے دن میں سو کر اُٹھتے تھے، رات کو دس بجے سے لے کر صبح پانچ بجے تک جاگتے رہتے تھے اور لکھنے پڑھنے کے کام میں مصروف رہتے تھے۔ سودا سلف خود لاتے تھے، کھانے میں سویابین کی کھچڑی بہت کھاتے تھے اور خود پکاتے تھے۔ رنگین کپڑوں کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ طرح طرح کی رنگین ٹائیاں اور پائپ جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے اپنے لیے بانس کا ایک مخصوص ٹی پاٹ بنوایا تھا جو مشہور تھیٹر شخصیت حبیب تنویر کو اتنا پسند آیا کہ وہ لندن جاتے وقت تحفتاً اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

انصاری صاحب کا ایک شعر یاد آرہا ہے جس سے ان کے شعری مزاج اور شاعرانہ نہج کا اندازہ ہوگا۔

میں بتاؤں کیا یہ شاعری، یہ نوائے دل، یہ سرودِ جاں

کبھی درد لفظوں میں ڈھل گیا کبھی ٹیس لئے میں ڈھل گئی

اختر انصاری کا ایک ضرب المثل شعر اور سنتے جایئے جو زبان زد خاص و عام ہے۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

✪✪✪✪

غالباً 1990 کا زمانہ تھا، رشید احمد صدیقی قبلہ وظیفہ یاب ہوکر یونیورسٹی چھوڑ چکے تھے۔ ان کی جگہ پروفیسر آل احمد سرور نے لے لی تھی۔ اس میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی مہربانی اور شفقت کے علاوہ این آر آئی درانی صاحب کا بڑا ہاتھ تھا۔ جو امریکہ میں ایک ثروت مند ہندوستانی کی حیثیت سے مقیم تھے اور اردو ادب سے شغف رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اردو ادب کی تاریخ از سرِ نو مرتب کی جائے۔ نیز غالب کے کلام کا انگریزی ترجمہ بھی کیا جائے کہ ان کے افکار سے مغربی دنیا کلی طور سے متعارف ہوسکے۔ تحقیق و ترجمہ کے نازک کام کے لیے انہوں نے نگراں ڈائریکٹر کی حیثیت سے آل احمد سرور کا انتخاب کیا۔ بعد میں سرور صاحب پروفیسر کی کرسی پر فائز ہوئے۔ کرنل بشیر حسین زیدی بھی ان کے مداحوں میں تھے۔ گوکہ سرور صاحب کی اندرونی شخصیت تخیل اور تصور حسن کا پیکر تھی مگر ان کی بیرونی شخصیت نہایت عملی اور کاروباری قسم کی تھی۔ لیکن اپنی جگہ یہ بھی سچ ہے کہ وہ منافقت کی مدح وثنا نہیں کرتے تھے۔

سرور صاحب کو جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ ان کی علمی فتوحات کے علاوہ ان کے حسنِ زن اور حسنِ خود بین وخود آرا کے بھی قائل و معقول ہوں گے۔ دورانِ تعلیم ہم سرور صاحب کے ممتاز شاگردوں میں نہیں تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ہمیں کیا اچھے اچھوں کو گھاس نہیں ڈالتے تھے۔ اس کی وجہ تسمیہ ظاہر ہے کہ ہمارا شمار ادب کے گھوڑوں میں نہیں ہوا تھا اور گدھوں میں ہم شامل نہیں تھے۔

شعبے میں مسعود علی ذوقی بھی تھے۔ تھیئٹر اور فلم کے آدمی تھے۔ نہایت نستعلیق، خوش ادا، خوش پوش، خوش خلق، خوش ذوق۔ میں نے انہیں ہمیشہ سوٹ بوٹ میں دیکھا مگر ان

کی دل سوزی کا یہ عالم تھا کہ غریب طلباء کی اعانت میں ہمیشہ پیش پیش رہتے۔ ہمارے ایک ساتھی تھے قاضی محمد زکریا، حیدر آباد سے آئے تھے۔ خستگی کے باوجود بھی کسی سے شکوہ سنج نہ ہوئے، ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے۔ اکثر مجھے کیفے ڈی لیلیٰ میں چائے پلانے لے جاتے، مزے مزے کی باتیں کرتے اور اپنی نظمیں سناتے۔ رومان پرور تھے۔ ہلکی پھلکی رومانی نظمیں سناتے۔ ذوقی صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ وہی ان کے کفیل تھے بعد میں دلّی یونیورسٹی میں لکچرر ہوئے اور پروفیسر اور شعبہ کے صدر رہے۔ دلّی میں پروفیسر علی محمد خسرو کی ان پر نظر عنایت رہی اور ان کی کرم گستری نے قاضی محمد زکریا یعنی امیر عارفی کو ثبات وقرار عطا کیا۔ دلّی والے ہو گئے تھے، حیدر آباد گئے تو ایک حادثہ میں شدید زخمی ہوئے اور جانبر نہ ہو سکے۔ مرحوم میں غضب کی حِس مزاح تھی۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی یادگار کتاب ''شعر شور انگیز'' کے اجرا کی تقریب تھی۔ امیر عارفی بھی ستائش کی تمنا لے کر ڈائس پر آئے اور اپنے تمہیدی کلمات میں یوں گویا ہوئے۔ میریات پر ''شور شعر انگیز'' حرف آخر ہے۔ مجمع سے آواز آئی ''شعر شور انگیز'' کہیے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے ہنستے ہوئے مداخلت کی۔ امیر عارفی نے درست کہا ہے کتاب کا نام ''شور شعر انگیز'' زیادہ موزوں و موثر ہے۔ امیر عارفی نے قاضی عبدالغفار پر اچھا کام کیا تھا۔ وہ نہایت شریف النفس، مخلص اور مہذب انسان تھے اور معصوم بھی۔ اب ایسے نیکو کار کہاں؟

✪✪✪✪

پروفیسر علی محمد خسرو اور ان کی بیگم طیبہ خسرو سے احقر کے خاصے اچھے مراسم رہے ہیں اور یہ سب کچھ اتفاقی طور پر ہوا تھا۔ دلّی یونیورسٹی کی لائبریری میں جگن ناتھ آزاد اقبال کی تصویروں کی نمائش کر رہے تھے۔ وہاں بیگم صاحبہ طیبہ خسرو بھی تشریف لائی تھیں۔۔ استاذی محترم خواجہ احمد فاروقی نے ان سے یہ کہہ کر میرا تعارف کرایا ''بیگم صاحبہ یہ ہمارے شاگرد ہیں۔ رفعت نہایت عمدہ افسانہ لکھتے ہیں۔ شعبہ میں ریسرچ اسکالر ہیں آپ انہیں اپنے افسانے دکھایئے ان کی اصلاح و اشاعت کے اہتمام میں یہ آپ کی بھرپور مدد فرمائیں گے۔''

لو یہ قصہ آل احمد سرور سے شروع ہو کر حدیث دلبراں تک جا پہنچا۔ بس اختتام ہوا چاہتا ہے۔ ایک کڑی باقی ہے۔ ہم کشمیر ریڈیو میں پروگرام ایگزیکٹو کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ انہیں دنوں اقبال چیئر کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے سرور صاحب کا ورود مسعود ہوا۔ وہ اپنی تقاریر ریکارڈ کرانے ریڈیو تشریف لانے لگے۔ ریکارڈنگ کے بعد میں انہیں یونیورسٹی چھوڑنے جا رہا تھا، سرور صاحب موٹر میں سوار ہو چکے تھے اتنے میں ایک چندے آفتاب چندے ماہتاب لڑکی نے موٹر کے نزدیک آ کر مجھ سے درخواست کی، فیاض صاحب موٹر یونیورسٹی جا رہی ہے، کیا مجھے بھی چھوڑ دیں گے۔ میں نے ایک نظر لڑکی پر ڈالی اور سرور صاحب سے اجازت طلب کی۔ ''سرور صاحب یہ گل افروز ہیں، یونیورسٹی جانے کے لیے لفٹ مانگ رہی ہیں آپ کی اجازت ہو تو پیچھے بٹھا دوں''۔ سرور صاحب نے گل افروز کو نظر بھر کر دیکھا اور مسکرا کر بولے ''بھائی نیکی اور پوچھ پوچھ''۔

✪✪✪✪

کتاب چہرے

سلطان جہاں منزل میں انجمن ترقی اردو ہند کی لائبریری تھی جہاں پاکستانی رسائل کثرت سے آتے تھے، لائبریرین حبیب خان مرحوم تھے نہایت شائستہ، سرتاپا خلوص ہمارا زیادہ تر وقت سلطان جہاں منزل لائبریری میں گزرتا۔ پاکستانی رسائل میں ہماری کہانیاں شائع ہوتیں تو ہم اکثر نظر بچا کر رسائل اپنی فائل میں رکھ لیتے۔ مرحوم حبیب خان کی شرافت ہی تھی کہ وہ ہماری چوری بلکہ سینہ زوری کو نظر انداز کرتے اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتے۔

بی اے میں اردو ہمارا مضمون تھا۔آئے دن خلیلؔ صاحب، جذبیؔ صاحب، قاضی عبدالستار صاحب سے ملاقاتیں ہوتیں۔ بحث و تمحیص کا بھی موقع ملتا۔اکثر یہ سبھی حضرات واجد خان صاحب کی لائبریری کینٹین میں بیٹھتے۔ واجد خان صاحب جاوید کمال کے نام سے شاعری کرتے تھے۔ نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔راہی معصوم رضا، اشفاق پاپے شاہ صاحب اور منو بھائی (بریگیڈیئر اسرار رحیم خاں کے بڑے بھائی) جاوید کمال کے عاشقوں میں تھے،کبھی کبھی اس بزم بے تکلف میں نشاط احسن بھی شریک ہو جاتے۔ جاویدؔ کمال کو شاعری کے علاوہ سینما بینی کا بے حد شوق تھا، اکثر وہ راہی کے ساتھ نئی فلم دیکھنے کے لیے پہلے دن تھیٹر تشریف لے جاتے۔ان ہی دنوں ''نئی عمر کی نئی فصل،، فلم کی شوٹنگ علی گڑھ یونیورسٹی میں ہو رہی تھی، فلم کے ڈائریکٹر بھارت بھوشن کے بڑے بھائی آر چندرا تھے۔ راہی فلم یونٹ کے ساتھ گھل مِل گئے۔ ان دنوں ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ راہی فلمی دنیا کا راستہ اختیار کریں گے۔ یہ تو معلوم تھا کہ وہ شاہد اختر کے نام سے رومانی دنیا الٰہ آباد کے لیے ناول لکھتے ہیں مگر اس کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ درس و تدریس کا پیشہ چھوڑ کر فلم نگری کا رُخ کریں گے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کے شعبۂ اُردو سے راہی بطور لیکچرار وابستہ ہو چکے تھے۔ سرورؔ صاحب صدرِ شعبہ تھے۔ راہی صاحب کا ایک شادی شدہ خاتون سے معاشقہ ہوگیا اس پاداش میں انہیں عارضی ملازمت سے علاحدہ کردیا گیا اور وہ علی گڑھ میں اپنی کشتیاں جلا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ممبئی چلے گئے۔ جاوید کمال کی کینٹین بند ہوگئی تو وہ یونیورسٹی کے شعبہ نشرواشاعت سے وابستہ ہوگئے۔ پی آر او ہوگئے تھے۔ ان کی بعض غزلیں لتا منگیشکر نے گائی ہیں۔ جگر ہائے لخت لخت کے مانند ان کی غزلیں ادھر اُدھر رسائل میں بکھری پڑی ہیں۔ کاش کوئی صاحبِ نظر ان کے کلام کو اکٹھا کر کے کتابی صورت میں شائع کردے۔ اس سلسلہ میں کنور اخلاق محمد خاں شہریار بہتر رہنمائی کرسکتے ہیں۔ واجد بھائی (جاوید کمال) اخلاق اور شائستگی کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ جب بھی ہم کینٹین جاتے وہ بہ نفس نفیس ہماری میز پر آکر ہماری خیریت دریافت کرتے، عمدہ چائے سے تواضع کرتے اور ہمارے اصرار کے باوجود بل لینے سے ہمیشہ انکار کردیتے۔ بعد میں ہماری بہنیں جب یونیورسٹی میں پڑھنے گئیں تو وہ بڑے بھائی کی طرح ان کا خیال رکھتے، نہایت شفقت و محبت سے پیش آتے گویا ہماری کمی کو انہوں نے کبھی محسوس نہیں ہونے دیا۔ افسوس! کیسے کیسے گوہر گراں مایہ تھے جو نہ رہے بس اپنی یاد کی خوشبو چھوڑ گئے جو ہمارے وجود کو مہکاتی رہتی ہے۔

✪✪✪✪

ڈاکٹر وحید اختر حیدرآباد سے آئے تو یونیورسٹی میں ان کا تقرر جنرل ایجوکیشن شعبے میں بطور لکچرار ہوا۔ بڑے پڑھے لکھے شائستہ آدمی تھے۔ ''صبا'' میں سلیمان اریب ان کی نظمیں بڑے اہتمام سے شائع کرتے تھے۔ خواجہ میر درد پر انہوں نے نہایت عمدہ تحقیقی کام کیا تھا۔ ہم ان کے نام اور کام سے واقف تھے۔ اتفاق سے کم عمری ہی میں ہمارا ایک افسانہ ''اندھیرے کا پھول'' غالباً 60 یا 59 میں ''صبا'' رسالہ میں شائع ہوگیا تھا اور بزعم خود ہم بڑے افسانہ نگاروں کے زُمرے میں اپنا شمار کرنے لگے تھے۔ تو ہوا یوں کہ وحید اختر صاحب نے کلاس میں حکم صادر کیا کہ اپنے پسندیدہ افسانہ نگار پر مضمون لکھئے۔ ہمارے ایک یارِ غار اجمال مہدی عرف الن میاں نے شوخیِ تحریر کا مظاہرہ کرتے ہوئے

ہمیں اپنا پسندیدہ افسانہ نگار قرار دے دیا اور مضمون میں ساتھ ساتھ ہمیں بھی لپیٹتے ہوئے یوں رقم طراز ہوئے فیاض رفعت نہ صرف بالائے قلعہ کے اعلیٰ اور بالا افسانہ نگار ہیں۔ یونیورسٹی کے حدودِ اربعہ میں بھی نقو سے لے کر شبراتی اور بقراتی تک اور پنواڑی سے لے کر دھوبی تک ان کی فسانہ گوئی کے والا و شیدا ہیں، وہ نہ صرف آسمانی افسانہ نگار ہیں بلکہ عالم نباتات و حیوانات میں بھی ان کا نام مہر نیم روز کے مانند چمک رہا ہے، ان کا حالیہ افسانہ ''شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں'' شہرتِ عام اور بقائے دوام کے نئے ریکارڈ قائم کر رہا ہے، وہ دن دور نہیں جب ایچ ایم وی کے ریکارڈ پر بنا ہوا کتا ان کی عظمت کے اعتراف میں اپنی جان ہلکان کر لے گا اور یہ کہتے ہوئے واصل شہادت ہوگا کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

اجمال مہدی عرف الن میاں کی نقد آگہی کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید اختر خنداں بہ لب ہوئے کہ '' آپ کی طنزیاتی اور مضحکاتی تحریر پڑھ کر ہمیں گل قند کا مزہ آیا، کہیں آپ پیشے سے عطار تو نہیں ہیں۔ کوشش جاری رکھئے اردو تنقید کو آپ کی ضرورت ہے۔''

اجمال مہدی برسوں یونیورسٹی کی سڑکوں پر اپنی تاریخی سائیکل پر مٹر گشتی کرتے رہے جو اپنی قدامت میں پطرس بخاری کی سائیکل سے آگے نکل گئی تھی۔ کلاس میں اکثر ان کی حاضریاں کم رہتی تھیں مولانا آزاد لائبریری کی چہار دیواری کا چکر لگاتے تو انہیں دیکھا گیا تھا۔ مگر باب علم الکتاب میں دخول و نقول سے وہ ہمیشہ بے بہرہ رہے۔ پڑھنے لکھنے سے انہیں خدا واسطے کا بیر تھا۔ نقل کرنے میں ان کی عیاری کے آگے عمرو عیار بھی پانی بھرتا نظر آتا تھا۔ انہوں نے بی ایس سی کی ڈگری بڑے آرام سے حاصل کی حالانکہ کیمسٹری میں ان کا مبلغ علم (CH-4) فارمولہ تک محدود تھا، اگر اس سی ایچ فور میں سے فور کو حذف کر دیا جائے تو الن میاں باقی بچیں گے۔ دبلے پتلے اتنے تھے کہ لیلا کی انگلیاں اور مجنوں کی پسلیاں بھی شرما جائیں مگر حاضر جواب ایسے کہ اچھے اچھوں کو لاجواب کر دیں۔ موقع شناس ایسے کہ اگر سیاست میں چلے جاتے تو وزیر با تدبیر بن جاتے۔

بی ایس سی فائنل کے امتحان شروع ہوا ہی چاہتے تھے کہ ناسازئ طبع کا عذر پیش

کر کے یونیورسٹی کے اسپتال میں داخل ہو گئے۔ کسی پیر فقیر کے مشورے پر انہوں نے داڑھی بڑھالی تھی حالانکہ بوقت ضرورت غالی قسم کے کمیونسٹ بن جاتے تھے، مختلف فلاحی اداروں سے مالی امداد حاصل کرنے کا اس سے بہتر حربہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ بطور خاص رجسٹرار آفس سے حضرت نگراں کاپی اور امتحان کا سیل بند پرچہ لے کر الن میاں کے بیڈ پر تشریف لائے جو نقاہت اور کمزوری کا اظہاریہ بنے مسلسل کراہ رہے تھے۔ اسی عالم اضطراب میں مریضِ امتحان نے ہچکیاں لیتے ہوئے پہلے گلوکوز کی فرمائش کی بعد میں کاپی اور پرچے کو ہاتھ لگایا۔ بے چارے حضرت نگراں خود خفقان میں مبتلا ہو چکے تھے۔ خاموشی سے حسرت و حیرت کی تصویر بنے ایک کونے میں پڑی ہوئی کرسی پر فروکش ہو گئے اور دل کے بہلانے کو اخبار کی شاہ سرخیوں پر نظر کرنے لگے۔ انہیں غافل دیکھ کر الن میاں نے بازو سے امام ضامن کھولا اور چھوٹی چھوٹی پرچیاں نکال کر بڑے انہماک اور استغراق کے ساتھ نقل نویسی کا فریضہ انجام دینے لگے۔ وارڈ کے دیگر بیمار لڑکے ان کی ناتوانی پر تاسف کرتے ہوئے خاموشی سے اپنا پرچہ حل کر رہے تھے۔ آخری پرچہ ہونے سے ایک دن قبل نصیب دشمناں امتحان کے نگراں کو سن گن ملی کہ اجمال مہدی عرف الن میاں چھٹے درجے سے نقل کرتے کرتے بی ایس سی کے آخری سال تک کا سفرِ ظفریاب طے کر چکے ہیں اگر انہیں نقل سے روکنے کے لیے ان کی نقل و حرکت پر کڑی نظر نہ رکھی گئی تو ان کا نام گنیز بک میں آجائے گا۔

امتحان کے نگراں کا پیاں سمیٹ کر جب رجسٹرار آفس پہنچے تو انہوں نے جوش و خروش کے ساتھ اپنی سرخروئی کا جواز پیش کرتے ہوئے نگرانِ اعلیٰ سے عرض کیا۔ ''حضور میں آج قلب صمیم کے ساتھ خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ داڑھی والے حضرت اجمال مہدی عرف الن میاں کو غیر موجود پایا غالباً انہیں بھنک لگ گئی تھی کہ آج ان کی خیر نہیں''۔ نگرانِ اعلیٰ نے رول نمبر پڑھتے ہوئے ایک کاپی ان کی طرف بڑھادی۔ اگر اجمال مہدی رول نمبر 77 امتحان میں شریک نہیں ہوئے تو یہ کاپی کس کی ہے، کیا بھوت ان کا پرچہ حل کر گئے۔ برادرِ عزیز لڑکا پھر آپ کو چکمہ دے گیا۔ آپ نے خیال نہیں فرمایا اگلی

صف میں داڑھی مونچھیں صفا چٹ کرائے جو حضرت بیٹھے آپ کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے تھے وہ کون تھے؟''۔

غرض یہ کہ اجمال مہدی عرف الن میاں نے بی ایس سی کرلیا اور انگلستان جا کر ایک انگریز میم کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔ اب وہ کماتی ہے اور یہ کھاتے ہیں۔ خدا انہیں خوش رکھے اب ایسے ہمہ صفات لوگ کہاں۔

✪✪✪✪

جن دنوں ہم بی اے کر رہے تھے۔ ہمارے سینئر تپن بھائی نے ہمیں پنی کوٹھی راحت کدہ میں بلوالیا تھا۔ وہ ہمارے اتالیق بھی تھے۔ انگریزی اخبار انڈین ایکسپریس پڑھنے کی چاٹ انہوں نے ڈالی۔ ہمارے ساتھ انعام خان بھی رہتے تھے۔ یہ پری یونیورسٹی میں تھے۔ عرفان اور صفی امیر نشان سے آجاتے تھے۔ جری پٹھانوں کی سب خوبیاں ان میں موجود تھیں۔ الطاف فریدی بھی تھے۔ یہ یونیورسٹی ٹریژرار عبید الرحمٰن خان شیروانی صاحب کے یہاں حبیب منزل میں رہتے تھے۔ میرس روڈ سے یہ اکثر اپنی چھوٹی سی مورس موٹر میں چلے آتے تھے۔ موٹر کو عجائب خانہ میں ہونا چاہئے تھا۔ مگر یہ چلاتے تھے وہ چلتی تھی۔ وسیم شیروانی شہر سے یونیورسٹی آتے تھے۔ آواز میں گھن گرج تھی، ذرا زور سے بول دیں تو سامنے والے کا پتہ پانی ہوجائے۔ پان کے شوقین تھے۔ کیفے ڈی لیلا میں باقاعدگی سے بیٹھتے تھے۔ طنطنہ اور غلغلہ ایسا کہ ان کی آمد سے رن کانپتا تھا۔ لوگ ادھر ادھر کھسکنا شروع ہوجاتے۔ سلیم بلکہ پرنس سلیم ٹونک سے پڑھنے آئے تھے۔ تپن بھائی کے ساتھ فیملی ممبر کی طرح رہتے تھے۔ اسرار رحیم خاں سلیمان ہال میں رہتے تھے اور بی ایس سی فرسٹ ایئر میں تھے۔ اسد اللہ خاں یعنی ہمارے اسد بھائی ایم ایس سی کے طالب علم تھے۔ بہت مہین اور لطیف طنز کرتے تھے۔ آیئے ان سب کے ساتھ پرانی یادوں کو تازہ کیا جائے۔

شروع کرتے ہیں انعام خاں سے۔ پستہ قد ضرور تھے مگر شورہ پشت ہرگز نہیں۔ سائیکل پر سواری کرتے تو گمان گزرتا جیسے کوئی نابالغ سرکس میں کرتب دکھا رہا ہے۔

پیڈل کی تلاش میں پچپاس ڈگری کا زاویۂ قائمہ بناتے نظر آتے اور یہ عمل ہر دو ٹانگوں سے مسلسل جاری رہتا۔ بالکل دھان پان مگر غصّہ ناک کی پھنگی پر رکھا رہتا۔ غنیم چاہے ہاتھی کے جُثّے کے برار کیوں نہ ہو یہ بہ انداز خوبی مبازرت کے لیے للکار دیتے۔ ایک انگل بھر چاقو جیب میں اس اعتماد سے رکھتے گویا اے کے 47 لے کر چل رہے ہوں۔

موصوف کو یونین کی سیاست میں زبردست دلچسپی تھی۔ خود تو الیکشن نہیں لڑتے تھے مگر لڑاتے ضرور تھے۔ علی گڑھ نمائش کے ایسے عاشق کہ مجنوں لیلیٰ کا نہ ہوگا۔ صبح، دوپہر، شام نمائش گاہ میں گزارتے۔ ذرا آرام کے لیے یونیورسٹی کیمپ میں چلے جاتے فریش ہوکر پھر شب باشی کے لیے کمربستہ ہوجاتے۔ شکیلہ بانو بھوپالی کی قوالی کی محفل میں ضرور رہتے۔ کجری اور بدیسیا بھی بڑے شوق سے سماعت فرماتے اور تو اور ہائے ہائے کے بازار کی رونق بھی ان کے دم کا ظہورہ تھی۔ نیلم وجینتی مالا کی نوٹنکی کی چکاچوندھ ان کے دم سے قائم تھی۔ ریمن سرکس میں حاضری نہ دیں بھلا کہاں ممکن تھا۔ عشائیہ کے لیے سہارن پور کے نامی ہوٹل میں تشریف لے جاتے حلوہ پراٹھا اور سیخ کھا کر ہوٹل والوں کو مشکور کرتے۔ ہاشم سرمہ والے بریلی سے تشریف لاتے تو سرمے کی پڑیاں بطور خاص انہیں پیش کرتے۔ بدایوں کے پیڑوں کی دوکان ان کی چشم عنایت کی منتظر رہتی۔ اسے ان کا دبدبہ ہی کہیں گے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ زبردست مارے رونے نہ دے کے محاورے کو غلط ثابت کر چکے تھے۔ نماش کا قصّہ ہے انعام خاں کی اگوانی میں ہم لوگ کشاں کشاں مُزمّل گیٹ سے دربار ہال کی طرف رواں دواں تھے، سامنے سے وی ایم ہال کے سینئر چھ فٹ کے محمود خاں اپنے حواریوں کے جلو میں چلے آرہے تھے۔ انہوں نے یونین کے گزشتہ انتخابات میں انعام خاں کے امیدوار کی جم کر مخالفت کی تھی۔ بس انعام خاں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنا انگلی بھر چاقو نکال کر غنیم کی طرف جھپٹے۔ خاں صاحب نے رسان سے کلائی پکڑ کر ان کی ننھی سی تلوار چھین کر جیب میں ڈال لی اور مسکرا کر خوش دلی سے بولے پنسل بنانے کے کام آئے گا۔ یہ کہہ کر خاں صاحب آگے بڑھا ہی چاہتے تھے کہ میاں انعام پیرتسمہ پا کے مانند ان سے چمٹ گئے۔ ہم لوگوں نے بڑی مشکل سے

خاں صاحب کو ان کی گرفت سے آزاد کرایا جو غصّے سے لال پیلے ہوتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''فیاض بھائی آج بچہ سمجھ کر چھوڑ دیا ہے آئندہ گستاخی کی جرأت کی تو چٹنی بنا کر سموسے کے ساتھ کھا جائیں گے''۔ خاں صاحب کی حس مزاح نے ہمیں بھی گدگدا دیا پیچ و تاب کھاتے ہوئے انعام خاں کے جوش جنوں پر قدغن لگانے کا کام وسیم نے کیا۔ ''بس پہلوان بس غصہ تھو کیے۔ وہ دیکھو سامنے سے پروکٹوریل ٹیم چلی آ رہی ہے۔ مختار صاحب بھی ساتھ ہیں، ان کے ہاتھ میں چھڑی بھی ہے''۔ مختار صاحب ہمارے پراکٹر تھے اور لڑکے ان کے آگے بیدِ لرزاں کی طرح کانپتے تھے۔ مختار صاحب کو ہم نے ہمیشہ ترکی ٹوپی اور شیروانی میں دیکھا ان کے علاوہ نواب چھتاری ترکی ٹوپی کو اپنی شناخت بنائے ہوئے تھے جو یونیورسٹی کے چانسلر تھے اور یوپی کے گورنر بھی رہ چکے تھے۔ کانووکیشن کے موقع پر ان کی سج دھج دیکھنے لائق ہوتی تھی۔ ہمیں یقینِ کامل ہے کہ جنّت مکانی اتاترک پاشا کی آسمان میں پرواز کرتی ہوئی روح نواب صاحب قبلہ کی ترکی ٹوپی کو دیکھ کر مرحبا کہے بغیر نہ رہتی ہوگی۔

یہاں ہم اپنے پرانے رفیق قاضی جمال الدین سابق صدر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کا ذکر مسعود بطور خاص کرنا چاہیں گے جن کی یونین میں رسم تنصیب کے موقع پر کی گئی انگریزی تقریر پر ہمیں ترکی کا گمان ہوا تھا۔ یہ بھی کسی ترک معشوق کے تیر نظر کا شکار تھے۔ سپہ گری جناب کا پیشہ ٹھہرا، یار لوگوں کا کہنا ہے کہ چینیوں کے خلاف نیفا میں محاذ آرائی کے وقت موصوف کی ترکی ٹوپی نے کمال دکھایا تھا۔ چینیوں کو گمان ہوا کہ موصوف کے سر پر سُرخ آگ کا گولا روشن ہے۔ جو بلائے ناگہانی بن کر ان کی جانب بڑھ رہا ہے۔ وہ بے چارے مخبوط الحواسی کے عالم میں ہندی چینی بھائی بھائی کا نعرہ لگاتے راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ تو جناب یہ تھا ترکی ٹوپی کا کمال، قاضی محاذِ جنگ سے زندہ سلامت لوٹ آئے۔ خدا انہیں سلامت رکھے کیا عجوبۂ روزگار شخص تھے۔

✪✪✪✪

آئینے اور عکس

ابھی کچھ دنوں قبل ہم علی گڑھ گئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وقت کی بدلتی کروٹوں نے علی گڑھ کو کیا سے کیا بنادیا۔ جدھر دیکھئے کنکریٹ کا جنگل جڑ پکڑتا جارہاہے۔ میرس روڈ اور امیر نشاں، ٹیکارام روڈ وغیرہ شہر کے پرسکون گوشے تسلیم کیے جاتے تھے وہاں قدیم عمارتوں کے نشان مٹتے جارہے ہیں اور گھونسلے نما فلیٹوں کا چلن بڑھتا جارہاہے۔ پیڑ پودے اور ان کی ہریالی معدوم ہوتی جارہی ہے۔ اسکوٹر،موٹر بائیکس اور کاروں کا اژدہام ہے۔ ہمارے زمانہ میں سائیکل کا رواج تھا۔ اکا دُکّا موٹر سائیکل اور خال خال موٹریں نظر آتی تھیں۔ جن شاہ راہوں پر ہم آزادانہ گھومتے پھرتے تھے وہاں سے گزرنا اب مشکل ہوگیاہے۔ خالی میدانوں پر بلند بالا عمارتیں کھڑی ہوگئیں ہیں۔ شہر کا سمندر اپنی حدوں کو توڑ کر دیہاتوں سے جاملاہے۔ زراعتی زمینیں بلند بالا عمارتوں کے بوجھ سے دبی کراہ رہی ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی کی یلغار نے فضائی آلودگی، کثافت اور گندگی کو جنم دیاہے۔ مادی ترقی نے انسانی جذبوں اور قدروں کو مسمار کر کے رکھ دیاہے۔ مشترکہ خاندان کا تصور ٹوٹ پھوٹ کر ملیامیٹ ہو چکا ہے۔ خودغرضی کے ساتھ ساتھ سفا کی بڑھتی جارہی ہے۔

آیئے اب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں یونیورسٹی کے پرانے چہروں سے آپ کا تعارف کراتے ہیں جنہیں لوگ فراموش کر چکے ہیں اور بھولتے جارہے ہیں۔

اسٹیشن پر اچانک ہمارے ایک بزرگ ہمیں دیکھ کر ہم سے لپٹ گئے۔ یہ پروفیسر معزز علی بیگ تھے، شعبۂ نفسیات کے ہمارے استاد۔ ان کا بھی ایک زمانہ تھا جس سے محبت کرتے تھے اس پر جان نثار کرتے۔ بس اصولوں کے معاملے میں کسی سے مصالحت نہیں کرتے تھے۔ یونیورسٹی کے کٹھ ملاؤں نے ان کی حد سے زیادہ مخالفت کی تو وہ

انتقامی جذبے کے تحت جن سنگھ پارٹی سے وابستہ ہوگئے اور خم ٹھونک کر الیکشن کے میدان میں کود پڑے اور جن سنگھ کے ٹکٹ پر ہی یوپی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اسی دور میں وہ اتر پردیش اردو اکیڈمی کے صدر بھی رہے۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ خلیج کو پاٹنے میں پل کا کام کیا۔ خدا انہیں لمبی عمر دے، کیا خوب آدمی ہیں۔

یاد تو بہت سے لوگ آتے ہیں، کس کا ذکر کروں اور کسے بھول جاؤں۔ ہماری طالب علمی کے زمانے میں شہناز ہاشمی ہوا کرتیں تھیں۔ نوخیزی اور نوعمری میں ہی شعبہ انگریزی میں لیکچرر ہوگئیں تھی، ان کے حسن کی تابانی کا یہ عالم تھا کہ ان پر مہر نیم روز کا گمان ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کے چہرے پر سرخ گلاب کھلے ہوئے ہوں۔ ادبی سرگرمیوں میں بے حد دلچسپی لیتی تھیں۔ خال خال اردو میں افسانے بھی لکھتی تھیں۔ شعبۂ سیاسیات کے اُستاد شفیق بیگ سے ان کا رومان شادی میں بدل گیا مگر یہ رشتۂ ازدواج جلد ہی ٹوٹ بھی گیا۔ بطور پروفیسر سبکدوش ہوکر شمشاد مارکیٹ کے ایک فلیٹ میں تنہائی کے دن گزار رہی تھیں۔ شام کی چہل قدمی کے بعد اپنے بیڈروم میں جا کر سوگئیں کبھی نہ بیدار ہونے کے لیے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ذاتی ملازم نے ان کا گلا دبا کر انہیں مار ڈالا تھا۔ یہ ایک دلخراش سانحہ تھا جس نے ہمیں دن بھر اُداس رکھا۔ ان کی موہنی صورت کے دھندلے نقوش آج بھی ذہن پر مرتسم ہیں۔ لیکن موت سے کس کو رستگاری ہے۔ زندگی کی بوقلمونی قائم رہتی ہے اور جانے والے کی بس یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔

✪✪✪✪

جب سلطان جہاں منزل کی طرف سے میرا گزر ہوا تو مجھے پنڈت حبیب الرحمٰن شاستری یاد آگئے جو سنسکرت کے بے بدل عالم تھے اور ہندی ادبیات کے فاضل تھے۔ ان کے ایک صاحبزادے انوار ہمارے دوست تھے۔ اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ ان دنوں عقیل شاداب (اردو کے منفرد شاعر) یونیورسٹی میں طالب علم تھے۔ آج کل مستقل طور سے اپنے وطن کوٹہ (راجستھان) میں مقیم ہیں۔ یہ پنڈت حبیب الرحمٰن شاستری کے چھوٹے داماد ہیں اور پنڈت جی کی چھوٹی صاحبزادی طاہرہ ان کو منسوب ہیں۔

علی گڑھ میں ڈاکٹر ابن فرید بہت یاد آئے جنہوں نے اپنی قیمتی زندگی کا بیشتر حصّہ علی گڑھ میں گزار دیا۔ یہاں سے پی ایچ ڈی کی اور لمبی جدوجہد کے بعد سماجیات کے شعبہ میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ علیم صاحب کے صاحبزادے بھی اسی شعبہ سے وابستہ تھے جو بعد میں حلیم پوسٹ گریجویٹ کالج کانپور میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے اور آخری سانسوں تک اسی کالج سے وابستہ رہے۔

علی گڑھ میں نفاست علی خاں راہی ہمارے پڑوسی تھے اور ان دنوں راہی بلند شہری کے نام سے رومانی نظمیں لکھتے تھے جو باقاعدگی کے ساتھ خوشتر گرامی کے رسالہ بیسویں صدی میں شائع ہوتی تھیں۔ ان کے والد جناب یٰسین علی خاں شہاب برنی آغا حشر کا زمانہ دیکھے ہوئے تھے اور خود بھی بہت عمدہ ڈرامہ نویس تھے۔ ان کا طویل ڈرامہ پروفیسر آل احمد سرور نے اردو ادب علی گڑھ میں بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔ ڈرامہ کا عنوان تھا ''اہرمن ویزداں''۔ میں اکثر ان کے پاس جا بیٹھتا تھا وہ مزے لے لے کر آغا حشر کی زندگی اور ڈراموں کے بارے میں پرانی یادوں کو تازہ کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے جو باتیں مجھے بتلائی تھیں اور آغا صاحب کی زندگی اور فن کے بارے میں جو کچھ انکشافات کئے تھے وہ بالکل اچھوتے اور طبع زاد تھے اور ان کے خیالات سے مجھے اتنی روشنی ملی کہ میں نے آغا حشر پر ایک مضمون قلم بند کرڈالا۔ جو رسالہ ''ادیب'' اور ''افکار'' کراچی میں شائع ہوا تھا۔ افکار کے مدیر صہبا لکھنوی تھے۔ راہی بلند شہری تلاشِ معاش میں دہلی چلے گئے وہاں گوپال متل کے ادارے ''تحریک'' سے وابستہ ہوگئے۔ یہ وہی گوپال متل ہیں جنہوں نے لاہور کی حکایت لذیر تحریر کی ہے۔

راہی عارضی طور پر کراچی چلے گئے تھے وہاں بھی ادبی صحافت سے وابستہ رہے جامِ نو کراچی میں انہوں نے اختر شیرانی پر ایک طویل مضمون تحریر کیا تھا۔ یہ مضمون ان کے معنوی اُستاد شیرانی صاحب کے لیے ایک طرح کا خراجِ عقیدت تھا۔ اختر شیرانی کو آج نئی نسل بھولتی جا رہی ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنے رومانی نغموں سے برصغیر میں دھوم مچا رکھی تھی۔ فیضؔ احمد فیضؔ، عبدالحمید عدمؔ، ساحرؔ اور مجازؔ کی شاعری پر ان

کے گہرے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ''جامِ نو'' کے ایڈیٹر مظہر خیری صاحب نے ہماری کئی کہانیاں اپنے مقبول جرید میں شائع کر کے دل جوئی کی۔ اُن دنوں ہم فیاض محمد خان کے نام سے لکھا کرتے تھے۔

راہی بعد میں راہی شہابی ہو گئے اور بڑے دم خم کے ساتھ انڈو پاک مشاعروں کی چھتیں اُڑانے لگے۔ راجستھان کی راجدھانی جے پور میں اقامت پذیر تھے۔ سابق وزیر اعلیٰ راجستھان جناب برکت اللہ خان صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری بھی رہے اور اردو اکیڈمی کے چیئرمین کا عہدہ بھی سنبھالا۔ بے حد وقیع شاعر تھے اور بڑے اعتماد اور ٹھسّے کے ساتھ اپنا کلام نذرِ سامعین کرتے تھے، خطابت کے آداب سے کماحقہٗ آشنا تھے۔ مجمع کو اپنی آواز کے سحر میں باندھ لیتے تھے۔ عشق اور رومان کے اس لالہ زار شاعر کو آخر ایک دن بے رحم موت لے اُڑی اور ان کے ہزاروں پرستاروں کو روتا بلکتا چھوڑ گئی۔

✪✪✪✪

حکایتِ لذیذ

ایک تھے مولوی شمس الدین علی گڑھ یونیورسٹی میں ٹھیکیداری کا کام کرتے تھے۔ بڑے مزے کے آدمی تھے، اکثر یونیورسٹی کی برگزیدہ شخصیتوں کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ ہمارے گھر ان کا آنا جانا تھا۔ ان کے صاحبزادے شبّر قریشی نے بی ایس سی کیا تھا۔ وہ ہمارے ٹیوٹر مقرر ہوئے، ہم انٹر سائنس میں تھے، فزکس بالکل نہیں آتی تھی۔ ہمارے ٹیوٹر حضرت شبر نے بہت زور لگایا مگر ہمیں نیوٹن کے لاء آف گریویٹیشن (Gravitation) یعنی نظریۂ کششِ ثقل کے علاوہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا، بالکل بے دست و پا ہوکر رہ گئے۔ استادِ محترم نے نقل کی پرچیاں بنانا سکھایا اور امتحان گاہ میں چھوڑ آئے لیکن نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے جو شاید گھاس چرنے چلی گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں فزکس کے ڈیماسنٹریٹر نے رنگ ہاتھوں پکڑ لیا او رہم حواس باختہ ہوگئے اور کلی وقتی طور پر افسانہ وافسوں کی دنیا آباد کرنے لگے۔

مولوی شمس الدین خیر خبر کے لیے گھر آتے اور یونیورسٹی کے ارباب حل و اقتدار کے قصے چھیڑ دیتے۔ وہ اکثر کرنل حیدر خاں کی باتیں کرتے تھے جن کے صالح اخلاق، وضعداری، مروت و محبت کے وہ دل سے قائل تھے۔ شیخ عبداللہ عرف پاپامیاں کی صاحبزادی محترمہ ممتاز حیدر گرلس کالج کی پرنسپل تھیں۔ اس کالج کے بانی ان کے والد شیخ عبداللہ پاپامیاں تھے۔ اکثر ممتاز آپا کا ذکر بھی نکل آتا جنھوں نے تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردی تھی۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے سوانحی ناول ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں ''عبداللہ کی ایک شام'' کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے۔ میرس روڈ کی یہ کوٹھی ایک زمانے میں حریّت نسواں اور آزادیٔ افکار کا گڑھ سمجھی جاتی تھی۔ قرۃ العین حیدر نے ماضی کے اوراق پلٹتے ہوئے علی گڑھ نسواں کالج کے بانی اور

ان کے افراد خانہ کا جو خوبصورت نقشہ کھینچا ہے۔ اُس کی جتنی ستائش کی جائے کم ہے۔

عبداللہ لاج کے مکین شیخ عبداللہ ایک کشمیری نومسلم تھے اور ان کی بیوی دلّی کے پرانے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور اعلابی کہلاتی تھیں۔ انہوں نے علی گڑھ گرلس کالج کا پودا لگایا تھا۔ شیخ عبداللہ نے سوانح عمری بیگم عبداللہ میں لکھا ہے کہ جب انہوں نے مدرسۂ نسواں کھولنے کی تجویز پیش کی تو اربابِ کالج اور عمائدینِ قوم بے حد برافروختہ ہوئے اور کہا ''ابھی مسلمان قوم لڑکوں کی مغربی تعلیم کی حامی نہیں ہوئی اور تم لڑکیوں کے اسکول کی بات کرنے لگے''۔

محض دو یا تین نوجوان ساتھی ابو محمد، سجاد حیدر اور ایک دو اور نوجوانوں نے ان کا ساتھ دیا اور وہ ان بزرگوں کے مقابلے پر صف آرا ہو گئے۔ زمانہ کروٹیں بدل رہا تھا، سوسائٹی عبوری دور سے گزر رہی تھی، تحریک آزادئ نسواں زور پکڑتی جا رہی تھی اور پھر وہ وقت بھی آیا جب قرۃ العین حیدر کے الفاظ میں شیخ عبداللہ کی بہو اور بیٹی مینا اور رینوکا دیوی فلم اسٹار بن چکی تھیں۔ ایک اور اعلیٰ خاندان کی لڑکی زبیدہ حق (جن کے کزن ضیاء الحق اسلامی مملکت پاکستان کے سربراہ بنے تھے) بیگم پارہ کے نام سے مشہور ہوئیں اور یہ ایک افسوس ناک بات ہوئی کیونکہ پرانے خیالات کے بزرگوں نے کہا تھا ہم نہ کہتے تھے کہ لڑکیاں اسکول اور کالج جا کر ایکٹریس بن جائیں گی؟

اب 1981 میں رینوکا دیوی یعنی خورشید آپا اپنی بہنوں سے پاکستان سے ملنے علی گڑھ آئیں..... محسن عبداللہ بھی ممبئی ٹاکیز سے ریٹائر ہو کر واپس آ گئے تھے۔ امریکہ نے انسانو ں کو دو خانوں میں بانٹا ہے۔ Achiever's اور Non Achiever's محسن بھائی دوسری کیٹگری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی پانچ بہنیں ڈاکٹر رشید جہاں، خاتون جہاں، ممتاز جہاں، خورشید جہاں اور برجیس جہاں۔ ایک سے ایک کامیاب اور اپنی اپنی زندگیوں سے مطمئن، پھر نہ جانے کیا ہوا کہ محسن بھائی اپنی بہنوں سے پیچھے رہ گئے۔

قرۃ العین حیدر نے عبداللہ لاج میں اقامت پذیر افرادِ خانہ کا کیا خوبصورت نگار خانہ سجایا ہے اس سے کماحقہ شناسائی کے لیے 'کارِ جہاں دراز ہے'' کا تفصیلی مطالعہ از

بس ضروری ہے۔ ہم اپنے قارئین کو فی الوقت یہ بتلانا ضرور سمجھتے ہیں کہ مس حیدر کا بچپن علی گڑھ میں گزرا تھا اور ان کے والد سیّد سجاد حیدر یلدرم ایم اے علی گڑھ کے گریجویٹ تھے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پہلے رجسٹرار رہے تھے۔ ان کا سن ولادت 1880 ہے۔ وطن مالوف قصبہ نہٹور ضلع بجنور ہے۔ آپ اردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ''جہاں پھول کھلتے ہیں''، ''سیل زمانہ''، ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ''، ''جواب'' وغیرہ مختصر افسانے 1900 سے لے کر 1907 تک کے عرصے میں اشاعت پذیر ہوئے۔ قرۃ العین حیدر کی والدہ نذر سجاد حیدر پریم چند سے پہلے سے افسانے لکھ رہی تھیں۔ عورتوں میں افسانوی ادب کی ابتداء انہوں نے ہی کی ہے ان کے بیشتر افسانے حقوقِ نسواں کی حفاظت اور آزادیٔ نسواں کی حمایت میں لکھے گئے ہیں۔ انہوں نے کئی نسوانی ناول بھی لکھے جو اپنے زمانے میں بے حد مقبول ہوئے۔

یلدرم کی تخلیقات کی دھوم سارے جہاں میں ہے یہ تو نہیں کہا جا سکتا مگر یہ ناگزیر حقیقت ہے کہ انہوں نے رومانی طرز بیان کی شگفتگی کو اس طور پر فروغ دیا کہ بعد کے آنے والے دور میں علامہ نیاز فتح پوری، ل احمد اکبر آبادی اور مجنوں گورکھپوری ان کے انداز نگارش کے آخر تک اسیر و قتیل رہے۔

✪✪✪✪

سبحہ و زنّار

تمہید سے قطع نظر آیئے میں آپ کی ملاقات اپنے ایسے غیر مسلم اساتذہ اور رفیقوں سے کراتا ہوں جنہوں نے مجھے زندہ رہنے اور زندگی بسر کرنے کے چلن اور آداب سکھائے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مجھے داخلہ نہیں ملا تو دوبے کے پڑاؤ سے آگے شہر کے مضافات میں بارہ سینی پوسٹ گریجویٹ کالج تھا۔ میں نے سائیکل اُٹھائی اور کالج جا پہنچا وہاں ان دنوں مراری لال جی وائس پرنسل تھے اور میں ان دنوں ہندی اور اردو صحافت سے جڑا ہوا تھا۔ شہر کے ہندی اخبارات کے خصوصی شماروں میں میرے مضامین اور کہانیاں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ مراری لال جی مجھ سے نہایت شفقت سے ملے انہوں نے مجھے نہ صرف ایم اے (سیاسیات) میں داخلہ دیا بلکہ پرنسپل سے سفارش کرکے میری پوری فیس معاف کرادی۔ صدر شعبہ ڈاکٹر شریواستو نہایت لائق پروفیسر تھے ان کی وسیع المشربی کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے کالج کے واحد مسلمان لڑکے کو پولیٹیکل سائنس ایسوسی ایشن کا صدر بنادیا اور کالج کی انتظامیہ نے ڈپٹی پریفیکیٹ کے عہدہ سے سرفراز کیا۔ سامنے ہاسٹل تھا جب میرا جی چاہتا میں اپنے ہندو رفقوں کے ساتھ ایک ہی تھالی میں کھاتا۔ دو برس کالج میں مزے مزے سے گزر گئے ایک دن بھی مجھے احساس نہیں ہوا کہ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ ہمارے ایک لیکچرار وارشنی صاحب تھے، بالکل ہم جیسے۔ کوئی دو چار برس ہم سے بڑے ہوں گے۔ وہ پی سی ایس کی تیاری کر رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں بھی آمادہ کرلیا کہ پی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں حصہ لیں۔ وارشنی صاحب پہلی کوشش میں پی سی ایس ہوگئے اور بعد میں ان کو آئی اے ایس میں شامل کرلیا گیا۔ ان کی فہمائش اور ترغیب پر ہم نے بھی پی سی ایس میں طبع آزمائی کی۔ 1972 کے بیچ میں جن لوگوں نے تحریری امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی ہم بھی ان میں

شامل تھے مگر بعد میں یونین پبلک سروس کمیشن نے ہمیں آل انڈیا ریڈیو کے لئے پروگرام ایکزیکٹیو کے طور پر منتخب کرلیا۔ یہاں بھی پروفیسر سروپ سنگھ ہمارے دہلی یونیورسٹی کے مہربان استاد کام آئے وہ سلیکشن کمیٹی کے ممبر تھے، انہوں نے ہماری کامیابی کی راہ ہموار کی ورنہ ہم کیا اور ہماری بساط کیا۔ باقی رہے نام اللہ کا۔۔۔۔۔

✪✪✪✪

کالج میں کلاس صبح سات بجے سے دس بجے تک لگتی تھی۔ کلاس ختم ہوتے ہی میں تمولی پاڑے چلا آتا۔ تمولی پاڑے میں بیشتر گھر ہندوؤں کے تھے۔ تمولی پاڑے سے آگے سرائے سلطانی میں مسلمانوں کی آبادی تھی ان میں بیشتر لوگ تالوں کی صنعت سے جڑے ہوئے تھے جن کا تعلق انصاری برادری سے تھا۔ قصائی، کنجڑے پھلوں کی آڑھت کرتے، موسم کے پھل اور سبزیاں بیچتے۔ سرائے سلطانی میں گھوسیوں کے بھی گھر تھے یہ لوگ بھینس پالتے اور دودھ فروشی کا کام کرتے۔ گھوسیوں کو پہلوانی اور کشتی کا بھی شوق تھا۔ انہوں نے اپنے اکھاڑے قائم کر رکھے تھے۔ جہاں علی الصباح ان کے پٹھے ڈنڈ پیلتے، بیٹھکیں لگاتے اور آپس میں زور کرتے۔ ان علاقوں کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ یہ شہر کے حساس ترین علاقوں میں شمار ہوتے تھے۔

تمولی پاڑے میں مہیش چندر سُہرد کا پرنٹنگ پریس تھا۔ مہیش کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، ان کے یہاں اکثر ہندی ادیبوں اور صحافیوں کی بیٹھک رہتی جن میں بھونیشور شرما، صاحب سنگھ مہرہ، نند کشور، جگن ناتھ، روشن لعل سُر یروالا، ایڈووکیٹ چنچل جی، سوریہ جی، لٹھ جی اور شیلیندر وغیرہ شریک ہوتے۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے بھونیشور شرما نے حسب معمول زور زور سے ہنستے ہوئے مہیش جی سے کہا۔ ''شہر میں ڈھنڈورا پٹواؤ گے تو بھی فیاض جیسی قد رکاٹھی اور دماغ کا آدمی ڈھونڈے سے نہیں ملے گا، اخبار نکالنا ہے تو اسے پکڑلو۔ اکیلے ہی پورا اخبار کالا کردے گا''۔

لیجئے صاحب ہندی میں ہفت روزہ اخبار ''پراودا'' بڑے طمطراق سے چھپنا شروع ہوگیا۔ یہ علی گڑھ کا پہلا رنگین اخبار تھا جو بلٹز کے پیٹرن پر نکالا گیا تھا۔ مجھ میں لکھنے کی

توانائی تھی۔ لکھنا پڑھنا میرا کل وقتی مشغلہ تھا۔ ہندی میں خاصی مہارت تھی، کسی بھی موضوع پر قلم برداشتہ لکھ سکتا تھا۔ کبھی کبھی ''پراودا'' کے سبھی صفحات پر میری نقش گری ہوتی۔ میرے علاوہ روش لعل سُریروالا، ایڈوکیٹ چینچل جی ''پراودا'' کے مستقل صحیفہ نگار تھے۔ ابتدا کے شماروں میں بھونیشور شرما کی تخلیقی تحریریں شائع ہوئیں۔ وہ ہندی کے نہایت ممتاز افسانہ نگار تھے اور ''گیانودے'' کلکتہ میں اکثران کی کہانیاں چھپتی رہتی تھیں۔ جو اپنے زمانے کا نہایت وقیع ادبی جریدہ تھا۔

ہفت روزہ ''پراودا'' کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے مہیش جی نے اسے روزنامہ میں بتدیل کردیا۔ ادارت کی پوری ذمہ داری میرے کاندھوں پر تھی۔ مہیش جی اور ان کے دونوں بھائی سریش اور پریش میری بے حد عزت کرتے تھے۔ دفتر میں دیر ہوجاتی تو گھر سے اصلی گھی کی پوریاں، مٹھائی اور اچار کی تھالی آجاتی۔ جی ہاں! تنخواہ بھی ملتی تھی۔ ایک سو پچاس روپئے اور وہ بھی قسطوں میں دس دس بیس روپئے کر کے، کبھی میں ناراض ہوکر احتجاج کرتا تو مہیش ہنستے ہوئے کہتے۔ ''بھائی فیاض اخبار تو تمہارا ہے کبھی کبھی تم میری چیزیں بھی چھاپنے سے انکار کردیتے ہو اور مجھے بولنے بھی نہیں دیتے اور پھر تمہیں روپیوں کی کیا ضرورت ہے بس ایک مٹھائی کھانے کا شوق ہے اور وہ مجھے بھی ہے، چلو مٹھائی کھا کے آتے ہیں گرم گرم دیسی گھی کی امرتیاں اتر رہی ہوں گی بعد میں دودھ بھی پئیں گے''۔

سوریہ نارائن، جگن ناتھ، گوری شنکر یہ تینوں مدن لعل ہتیشی کے اخبار ''پرکاش'' میں کام کرتے تھے۔ جگن ناتھ نے ''پراودا'' میں بھی کام کیا۔ بعد میں ''بھاشا'' اخباری ایجنسی میں چلا گیا۔ سوریہ اور پنڈت نند کشور بھی ''پراودا'' کے ساتھ وابستہ رہے۔ بعد میں پنڈت جی ''امراُجالا'' آگرہ کے ساتھ وابستہ ہوئے۔ جو ان دنوں علی گڑھ، متھرا میں بے حد مقبول تھا۔ گوری شنکر نے ہندی میں اپنا روزنامہ نکال لیا، وہ ہمارے چھوٹے بھائی اشفاق کے بے حد نزدیکی دوست تھے جو علی گڑھ سے انگریزی میں ''ڈیٹرائٹ (Datroit) اور کراس فائر (Cross Fire) کے نام سے اخبار نکال چکے تھے اور یو این

آئی کے ساتھ وابستہ رہنے کے بعد مستقل طور پر پی ٹی آئی میں چلے آئے تھے۔ کچھ دنوں تک انہوں نے ٹائمز آف انڈیا دہلی کے لیے بھی رپورٹنگ کی۔

علی گڑھ میں فساد ہو گیا تھا۔ فساد کے بعد حساس علاقوں میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔ تاریخ یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ ان دنوں علی محمد خسرو مرحوم علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ انہوں نے نہایت دانشمندی سے کام لیتے ہوئے فساد کی چنگاری کو یونیورسٹی کے اطراف واکناف میں داخل نہیں ہونے دیا۔ شہر میں کرفیو تھا، اتفاق سے میں کشمیر سے چھٹی پر آیا ہوا تھا ایک دن صبح ہی صبح دیکھا کہ گوری شنکر کھدر کا کرتا پیجامہ پہنے کمر پر تھیلا جھولا لادے ہوئے چلے آرہے ہیں میں نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''گوری شنکر یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کرفیو میں چلے آرہے ہو، کیا عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے، کہیں کچھ بھی ہو سکتا ہے''۔

''فیاض بھائی اب کوئی مارتا ہے تو مار دے، میرا دل نہیں مانا تم لوگوں کی یاد آرہی تھی۔ آٹا، دالیں۔ مرچ مسالے اور گھی تیل لے آیا ہوں، فساد کا کیا بھروسہ یہ تو مہینوں چلتا ہے، پھر زندگی کیوں رُکے اسے بھی تو چلتے رہنا ہے''۔

جہاں میں اب ایسے پراگندہ طبع لوگ چراغ لے کر ڈھونڈیئے تو بھی نہ ملیں گے۔

✪✪✪✪

فتو کے باپ انصاری برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ علی گڑھ میں محلّہ ٹیلے پر رہتے تھے پانچوں وقت کے نمازی تھے۔ چھجے پر ان کی رہائش تھی نچلے حصّے میں مکان کے ان کی چھوٹی سی پنساری کی دکان تھی جہاں دال، دلیہ، نمک، مرچ اور آٹا، گھی، تیل دستیاب تھا۔ محلے کے غریب غرباء تالے کی گھسائی کرنے والے، قلعی گر، رنگ روغن کے مزدور سودا سلف لے کر اپنا کام چلاتے تھے۔

فتو کے باپ ملاّ جی بڑے خدا ترس آدمی تھے اور اپنی حلال کی کمائی کا ایک حصّہ یتیموں، بیواؤں کے لیے ضرور نکالتے تھے۔ فتو ان کی اکلوتی اولاد تھی وہ اسے پڑھا لکھا کر کسی دفتر کا بابو بنانا چاہتے تھے۔ سٹی ہائی اسکول میں انہوں نے فتو کا داخلہ

کرادیا تھا۔ اسکول سے چھٹ کر آتا تو کٹی ہوئی پتنگ کی طرح جدھر ہوا کا رُخ ہوتا اُڑتا چلا جاتا۔ گولیاں کھیلتا، کرایہ پر سائیکل لے کر پورے شہر کی مٹر گشتی کرتا اور شام کے ڈوبتے ملگجی سایہ میں گھر کی دہلیز پر قدم رکھتا۔ ماں ہزاروں صلواتیں سناتی گالیاں اور کوسنے دیتی، مگر بھلا چکنے گھڑے پر پانی کہاں ٹھہرتا ہے وہ بے شرمی سے ہنستا رہتا اور ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس سے کھانے کا تقاضہ کرتا۔ ماں تو آخر ماں ہوتی ہے سب گلے شکوے بھول کر کچے چولھے میں آگ جلاتی سالن گرم کرتی اور گیہوں چنے اور جو کی روٹیاں توے پر سینکنا شروع کردیتی۔

ماں باپ کی ہزار کوششوں کے باوجود فتو نے روایتی اور رسمی تعلیم میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ ناولوں اور افسانوں کی حد تک اسے کتب بینی کا شوق ضرور تھا۔ تعلیم ادھوری چھوڑ کر شعر و شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ علی گڑھ میں شعری نشستوں کا رواج عام تھا اس نے اپنے زمانے کے مشہور استاد مختار ہاشمی صاحب کا دامن تھام لیا اور بڑے کروفر کے ساتھ مشاعرے پڑھنا شروع کردیئے۔

مختار ہاشمی کے یوں تو بے شمار شاگرد تھے مگر وہ خصوصی طور پر فتو اور جمنا پرشاد راہی کو پسند کرتے تھے۔ عرشی منّا کا کلام بھی وہ دیکھ لیتے تھے جو مزاحیہ رنگ میں شعر کہتا تھا۔ اُن دنوں محمود آفندی، شبّر صاحب، کباب علی گڑھی، جاذب صاحب اور غوث صاحب علی گڑھ شہر کے عمدہ شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔

فتو کا پورا نام فتح محمد انصاری تھا اور ان نے اپنا ادبی نام نازش انصاری تجویز کیا تھا۔ جلد ہی اس کا کلام گوپال متل کے رسالے ''تحریک'' میں شائع ہونے لگا ایک دن فتح محمد المعروف نازش انصاری ہمارے گھر آئے اور انہوں نے مژدہ سنایا کہ وہ ''نئے زاویئے'' کے نام سے ایک ادبی ہفت روزہ شروع کرنا چاہتے ہیں جس کا ڈکلریشن انہیں مل چکا تھا۔ ہم نے اشتراک کے لیے حامی بھرلی۔ یہ غالباً 1963 کی بات تھی ''نئے زاویئے'' کے پہلے شمارے میں سلام مچھلی شہری، خان غازی کابلی، خلیل الرحمٰن اعظمی، اختر انصاری اور میکش بدایونی کی تخلیقات شائع ہوئیں۔ بڑے تزک واحتشام کے

ساتھ ''نئے زاویئے'' کے چار شمارے شائع ہوئے بعد میں اس کی اشاعت موقوف ہوگئی۔مگر نازش کو اس کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ وہ علی گڑھ کے ادبی حلقوں میں اب اپنی شناخت بنا چکے تھے۔

انہیں دنوں عشرت امیر ادیب نے علی گڑھ ٹائمز کے نام سے ایک روزنامہ نکالا جو پورے تیس دن باقاعدگی سے نکلا یہ پہلا اور آخری اردو روزنامہ تھا جو علی گڑھ کی سرزمین سے شائع ہوا بعد میں یہ ہفت روزہ کی حیثیت سے زندہ رہا۔اس کے سرپرست شیر محمد قریشی تھے جو راشن کی ایک دکان چلا رہے تھے جہاں عشرت بھی ملازمت کرتے تھے۔ جب بھی اردو کا کوئی نیا اخبار نکلتا تو شیر محمد قریشی اس کی ضرور سرپرستی کرتے۔ ایک اور شخصیت بابو خان صاحب بھی علی گڑھ کے مسلمانوں کی قیادت کا علم اُٹھائے ہوئے تھے۔ بابو بھائی ماشاء اللہ بقید حیات ہیں اور سیاست میں ناکام ہونے کے بعد انہوں نے خود ہتھیار ڈال دیئے مگر اپنے بھتیجے کو میدان میں لے آئے جو سماج وادی پارٹی کے ٹکٹ پر ایم ایل اے منتخب ہوئے۔ ان دنوں خواجہ حلیم بھی ہوا کرتے تھے سیاست انہیں راس آئی اور وہ اتر پردیش حکومت میں وزیر باتدبیر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔
یہ تو ادھر اُدھر کی باتیں تھیں اصل مقصود نازش انصاری کا ذکرِ مسعود تھا۔نازش نے صحافت کے پیشے کو اپنا لیا اور باقاعدگی سے ایک نیا ہفت روزہ ''انحراف'' نکال رہے تھے جو علی گڑھ کے ادبی اور سیاسی حلقوں میں اپنی جگہ بنا چکا تھا اس کے ہمدردوں اور سرپرستوں میں انصار شمشی اور الطاف فریدی پیش پیش تھے۔

نازش انصاری نے قوم کی حالتِ زار کو سدھارنے کے لیے ایک اور اخبار جاری کیا تھا ہفت روزہ ''دشمن''، جس کا ہم شاید پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں۔ ان دنوں نواب علی یاور جنگ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر آئے تھے ان کی جدید پالیسیوں کو رجعت پسند علی گڑھ والوں نے قبول نہیں کیا۔ کٹھ ملائیت ان کا راستہ روک رہی تھی۔ کورٹ کی میٹنگ میں ہنگامہ ہوگیا۔ ہنگامے نے فساد کی شکل اختیار کر لی۔ یونیورسٹی کے لڑکوں نے وائس چانسلر کو زود کوب کیا، پولیس بلائی گئی فائرنگ ہوئی لڑکے زخمی

ہوئے۔ وائس چانسلر کو بہتر زخم آئے۔

نازش انصاری نے وائس چانسلر کی ناعاقبت اندیشی کے خلاف اپنے اخبار ''دشمن'' میں زبردست مخالفانہ مضمون شائع کیا اور نتیجے کے طور پر انہیں وائس چانسلر کیس میں ملزم بنالیا گیا۔ جن دیگر اہم لوگوں پر وائس چانسلر پر قاتلانہ حملے کی سازش رچنے کا الزام عائد کیا گیا تھا ان میں جسٹس بشیر احمد، پروفیسر ڈاکٹر بصیر احمد خاں اور یونیورسٹی کے رجسٹرار مجتبیٰ حسین آئی۔ اے۔ ایس جیسی شخصیتیں بھی شامل تھیں، ان سب کی گرفتاریاں ہوئیں یہ لوگ علی گڑھ کی جیل میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے جب کہ ان پر لگائے گئے سارے الزام قطعی طور پر جھوٹے تھے۔ نازش کو دلّی کے کافی ہاؤس سے گرفتار کیا گیا۔ ان کی گرفتاری کی خبر انگریزی اخباروں میں نمایاں طور سے پہلے صفحے پر شائع ہوئی تھی۔ لوک سبھا اور راجیہ سبھا دونوں ایوانوں میں ان کا اور ان کے اخبار کا تذکرہ ہوا اور وہ ہیرو بن گئے۔

مقدمے میں کوئی دم نہیں تھا اسے حکومت اتر پردیش نے آخرکار واپس لے لیا۔ نازش انصاری دلّی میں جا کر بس گئے اور صحافت کے پیشے سے جڑے رہے۔ انہوں نے کئی ڈائجسٹ اور ادبی رسالوں کی ادارت کی مگر افسوس کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے فتح محمد المعروف نازش انصاری کو ہم سے ناوقت جدا کر دیا اور ان کی موت کی خبر کسی موقر اخبار میں شائع نہیں ہوئی۔ ان کے پسماندگان میں بیوی کے علاوہ ایک بیٹا بھی ہے۔

یادِ ماضی

ہمارے گھر کے بغل میں شیعہ مسجد تھی جہاں نہایت کشادہ حوض بنا ہوا تھا۔ ہم لوگوں کا لڑکپن تھا۔ مئی، جون کی ٹھیک دوپہریوں میں خوب ڈبکیاں لگاتے۔ ہم تھے تو سُنّی العقیدہ مگر اکثر وہاں نماز پڑھ لیتے۔ اذان دینے کی ذمہ داری بنّی ابا کی تھی۔ امامت بھی وہی کرتے تھے۔اُن دنوں نماز پڑھنا بھی ہم لوگوں کے لئے کھیل ہی تھا۔کھیل ہی کھیل میں رُوزے رکھتے۔ شدید گرمی اور پیاس کے باوجود صراط مستقیم پر قائم رہتے۔ روزہ کھولتے وقت دنیا جہاں کی نعمتیں دسترخوان پر سجائی جاتیں۔ والدہ مرحومہ جنہیں ہم پیارسے بُوا کہتے تھے۔صوم صلوٰۃ کی پابند تھیں۔ ہم نے کبھی اُن کا ایک روزہ قضا ہوتے نہ دیکھا۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے۔ فجر سے ذرا پہلے بیدار ہو جاتیں۔ قرآن شریف کی تلاوت کرتیں تو اُن کے لحن کا جادو پوری فضا کو عبودیت سے بھر دیتا۔ جامع مسجد کے پیش امام احمد اللہ صاحب گلی سے گزرتے تو ہماری والدہ کے لئے دعاؤں کی بارش کرتے جاتے۔ ''سبحان اللہ سبحان اللہ، بھئی کیا لحن داؤدی پایا ہے....''

شیعہ مسجد سے ملحق کچھ وقف مکانات تھے۔ ایک شکستہ سے مکان میں اقبال عمر رہتے تھے۔ ذات کے تو مجاور تھے، مگر شاعری کا بالیدہ ذوق رکھتے تھے۔ مختار ہاشمی کو اپنا کلام دکھا لیتے تھے۔ رویندر جین مشہور فلمی موسیقار اُن کے دوستوں میں تھے۔اُن کے گلے میں راگنی کا بسیرا تھا۔ شعر بھی موزوں کر لیتے تھے۔ حمد و نعت، مناجات اور سوز و سلام خوب کہتے تھے۔ اکثر نثار احمد خاں نثار بھی آ جاتے۔ ہمارے گھر خوب خوب محفل جمتی۔ نثار سرتال کی باریکیوں سے آشنا تھے۔ ایسی تانیں اڑاتے کہ نغموں سے فضا معمور ہو جاتی۔ بعد میں گلے کے کینسر میں ایسے مبتلا ہوئے کہ آواز چلی گئی۔ اُنہیں کسی کی نظر

کھا گئی تھی۔ رویندر جبین نثار، اقبال عمر، نازش انصاری، جمنا پرساد راہی کے علاوہ عرشی مرحوم بھی مختار بھائی کے شاگردوں کی طویل فہرست میں شامل تھے۔ موصوف چوری ڈکیتی اور رہزنی کے پیشے میں نام کمانے کے بعد شعروسخن کے کوچہ میں داخل ہوئے تھے۔ مزاح میں شروع ہوئے اور سنجیدہ شاعری پر آکر تان ٹوٹی۔ آل انڈیا مشاعروں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔ شہر کے مشہور صنعت کار ظفر صاحب نے انہیں کام پر لگا دیا تھا۔ شادی بھی ایک پڑھی لکھی لڑکی آصفہ سے ہوگئی تھی۔ جو کسی اسکول میں مدرس تھیں۔ عرشی نے اپنی سبھی برائیاں ترک کردی تھیں مگر شراب اُن سے نہ چھوٹی۔ اکثر خون کی اُلٹیاں ہوتی تھیں جسے وہ پان کی پیک کہہ کر چھپا جاتے تھے۔ اُم الخبائث نے جان لے کر ہی اُن کا پیچھا چھوڑا۔

محمد علی روڈ پر واقع عثمانیہ ہوٹل کی تاریخی حیثیت تھی۔ یہاں شام سے رات گئے تک سیاسی، غیر سیاسی، ادبی، غیر ادبی، ناستک، آستک، شاعر و غیر شاعر۔ متشاعر بھانت بھانت کے لوگ نشست جماتے تھے۔ یونیورسٹی کے پروفیسر، طالب علم، تالوں کی جڑائی کرنے والے کاریگروں کے علاوہ بکسوؤں کے کاروباری اقبال بھائی، جلیل بھائی اور منشی حویلی رام بھی دن میں ایک بار حاضری لگوانا ضروری سمجھتے تھے۔ ہوٹل کے مالک یٰسین بھائی کا بھانجہ ٹھیکے پر ہوٹل چلاتا تھا۔ خوش اطوار اور خوش شکل نوجوان تھا۔ بچپن اور لڑکپن گجرات میں گزار کر آیا تھا۔ چائے بنانے اور ٹیبل تک لانے کا کام رفیق میاں کرتے تھے۔ ہم تو عثمانیہ میں ڈیرا ڈالے رہتے تھے۔ رفیق شاہین پھپاپے سے تقریباً روز محمد علی روڈ نکل آتے۔ شاعری خوب کرلیتے تھے ہم نے انہیں افسانے کی راہ پر ڈال دیا اور یہ چل نکلے۔ ایک ناول بھی تحریر کیا۔ عشرت امیر ادیب اور ان کے بڑے بھائی فرحت امیر دونوں افسانہ نگار تھے۔ فرحت نے رومانی اور جاسوسی ناول لکھنے میں کمال حاصل کیا۔ بعد میں ریلوے میں بابو ہوگئے اور لکھنے پڑھنے کی ادا بھول گئے۔ عشرت امیر کل وقتی ادیب ہی رہے۔ علی گڑھ ٹائمز اخبار بھی نکالتے تھے۔ آتشبازان میں اُن کا موروثی مکان تھا جس کے تہہ خانے میں شدید گرمی میں بھی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں۔

پرانی دنیا کے لوگوں نے بھی، آسائش و آرام کے لئے کیا کیا راستے نکالے تھے۔

عشرت کے سب میں بڑے بھائی راحت امیر نہایت موڈرن نوجوان واقع ہوئے تھے۔ دیوانند سے مشابہ تھے۔ لڑکیاں اُن پر جان چھڑکتی تھیں، مگر وہ لونڈوں کے عاشق تھے۔ پاکستان چلے گئے۔ پی۔ آئی۔ اے میں نوکری کر لی تھی۔ شادی کچھ زیادہ کامیاب نہ رہی۔ دیارِ غیر میں مرکھپ گئے۔ عزیزوں کو مٹی بھی نہ ملی۔ دوقومی نظریہ نے اجتماعی اور انفرادی طور پر انسانی زندگی کو اندوہناک المیوں سے دوچار کیا، جن کا شمار ممکن نہیں۔

عشرت امیر شادی کر کے مارہرہ شریف میں جا بسے۔ بیوی میونسپل اسکول میں ٹیچر ہوگئی تھیں۔ ایک بچّی ہونہار نکلی۔ بڑے ہو کر پولیس میں اسٹینوگرافر ہوئی۔ سب انسپکٹر پولس کے عہدہ پر فائز رہی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے ساتھ روز و شب کی رنگینیاں وابستہ تھیں۔

مشقِ سخن جاری ہی تھی کہ برسوں بعد رفیق شاہین کا خط ملا۔ من وعن نقل کرتے ہیں کہ قارئین کرام پر ہمارے جرأت آزما مشاغل آشکارہ ہوسکیں۔ اور اک ذرا شاہین کی پرواز کا بھی اندازہ ہو سکے۔ جو آجکل پوری طرح صوفی وصافی بن چکے ہیں۔ اور تعویذ گنڈوں کے پھیر میں پڑے ہوئے ہیں۔

''ڈیر فیاض رفعت

امید ہے کہ نغمہ بار ہوگے۔ تین چار دن پہلے ہی تمہیں خواب میں دیکھا تھا۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ تمہیں اور عشرت کو خواب میں نہ دیکھ لیتا ہوں۔ پُرانے سُہانے دن بہت یاد آتے ہیں۔ دلّی ''شمع'' کے آفس جانا اور وہاں سے پیسے لے کر دلّی گھومنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ سراج انور کی فوٹوگرافی کی دوکان پر گلزار دہلوی، سلام مچھلی شہری اور اظہار اثر سے ملاقاتیں، فلم آرٹ ''پیام مشرق''، ''ناز انصاری۔ شہزادہ تبسّم سب یاد ہیں۔ ان دنوں ''بانو'' پیام مشرق، فلم آرٹ، سوداگر کراچی اور نیا راہی کراچی میں چھپ کر جو خوشی حاصل ہوتی تھی وہ اب بہت زیادہ چھپنے پر بھی نہیں ہوتی۔ پہلے اُن منظروں کی

تلاش و جستجو رہتی تھی جو آنکھ سے اوجھل تھے۔اب دنیا دیکھ لی۔اب گزرے وقت کی سُہانی یادوں سے جی بہلتا ہے۔ چھمنا نسرین، بنّو،شاہجہاں، جمیلہ، منّی لوفر،تاراچند، کیلاش بابو..... طبلے اور سارنگیوں والا زمانہ اچھا لگتا ہے۔تمہارے دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھنا اور توحید مرحوم اور فاروق صاحب کے ہوٹل میں بیٹھ کر پلاٹ ڈسکس کرنا یاد آتا ہے۔ بہت دن سے عشرت کی کوئی خیر خبر نہیں ہے۔ ''مسعود محل'' کے سامنے سے گزرتا ہوں تو یاد آجاتا ہے تم عشرت اور میں یہاں چائے پینے آیا کرتے تھے۔''راحت کدہ'' بھی یاد آجاتا ہے۔خلیل الرحمٰن اعظمی، قمر رئیس، احمد جمال پاشا، اختر عادل، روپ، امیر عارفی سے ملاقاتیں بھی ذہن میں محفوظ ہیں......''

ہمارے ہمدم دیرینہ رفیق شاہین یار مہربان ہی نہیں نہایت خوش گلو بھی تھے۔مکیش کی آواز میں ایسی نغمہ سرائی کرتے کہ چلتی ہوئی گلی رُک جاتی۔ راجکپور کی وضع قطع میں رہتے تھے۔ انٹر کے بعد ہی گورنمنٹ پریس میں نوکر ہو گئے اور وہیں زندگی پار لگادی۔ بچوں نے کاروبار کو ترجیح دی اور ترقی کے نئے نشان قائم کیے۔ رفیق شاہین کی مشغولیات کا ذکر ہو چکا۔ ہاں ایک بات رہی جاتی ہے۔ رفیق شاہین کا شمار اب استاد شاعروں میں ہوتا ہے اور ان کی شاگردائیں کشمیر سے کنیا کماری تک پھیل چکی ہیں۔ خدا انہیں اور ان کی شاعرات کو خوش رکھے۔جو خوش گلو ہونے کے ساتھ ساتھ خوش بدن بھی ہیں۔

پرانی وضع کے بزرگ سیاست دان حافظ عثمان، یوسف قریشی ظفر بلڈنگ والے بشیر قریشی، لودی صاحب، ریاض پرنٹنگ پریس کے مالک شجاعت بھائی ہفت روزہ ''جمہور'' کے اڈیٹر شاہد علی خاں شیروانی، ترجمان اخبار کے مدیر اعلا فوق کریمی، نیوز پیپر ایجنٹ امان الرب ضیا جو کتب و رسائل کے ساتھ ساتھ المونیم کے برتنوں کا کاروبار بھی کرتے تھے مسلمانوں کے تہذیبی، اخلاقی، معاشی اور عمرانی بحران کو دور کرنے کے لیے نہ صرف 'غور و خوض' کرتے بلکہ عملی طور پر مشعل ہدایت کو روشن کئے رہتے۔ راقم کی سبھی سے یاد اللہ تھی۔

یوسف قریشی اور حافظ عثمان اکثر چوارہے پر واقع امان الرب ضیا کی دوکان پر نظر

آجاتے۔ ہر دو حضرات کانگریسی تھے۔ حافظ عثمان آزادی کی لڑائی کے سپاہی رہ چکے تھے۔ نہایت بے باک اور نڈر لیڈر تھے۔ بشیر بھائی کی بزازے کی بہت بڑی دوکان تھی۔ ریلوے روڈ پر واقع عظیم الشان عمارت ظفر بلڈنگ بھی ان کے بزرگوں کا عطیہ تھی۔ محلہ پھپالہ میں بھی کئی منزلہ عمارت ان کے بزرگوں کی ثروت مندی کا پتہ دیتی ہے۔ بشیر بھائی حزب اختلاف کی سیاست کرتے تھے۔ ''ملت'' کے نام سے آپ نے بڑے پیانے پر ایک روزنامہ کا اجرا کیا تھا۔ جس کے اڈیٹر لکھنو کے سلامت علی مہدی تھے۔ سیاست اور صحافت کے کام پر انہوں نے لاکھوں روپے لٹائے۔ وائے بدنصیبی اڑیل قوم کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اتنا ضرور ہوا کہ مسلمانوں میں اعلا تعلیم کے حصول کا رجحان ضرور بڑھا اور خصوصاً پسماندہ قوموں کے افراد کا شعور بیدار ہوا۔ قریشی صاحبان نہ صرف زیور تعلیم سے آراستہ ہوئے بلکہ مختلف شعبۂ جات میں پروفیسر کے عہدۂ جلیلہ تک پہنچنے کی سعادت حاصل کی۔ ان میں ہمارے ایک جونیئر ساتھی قیصر حیات بھی ہیں۔ ان کے والد قریشی صاحب کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اسی طور ہمارے ایک اور ساتھی انجینئر نگ کالج کے ایرانوٹکس شعبہ میں پروفیسر ہوئے اور کچھ دن قائم مقام وائس چانسلر بھی رہے۔ یہ تھے نور افضل، ان کے والد کی موٹریں چلتی تھیں۔ فضل الرحمٰن ایڈوکیٹ بھی اسی قبیلہ کے ممتاز افراد میں شامل تھے۔ کرمنل لائیرز میں ان کا جواب نہیں تھا۔

لیجئے بات کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں جا پہنچی۔ امان الرب، ضیا، جاسوسی دنیا اور شمع کے سول ایجنٹ تھے۔ ''جاسوسی دنیا'' اور ''شمع'' کے لئے گاہکوں کے تقاضے شروع ہو جاتے لوگ ایڈوانس بکنگ کرالیتے۔ اپنے مخصوص ملنے والوں کو یہ رسائل اس طرح چھپا کر دیتے جیسے کوکین کی پڑیا حوالے کر رہے ہوں۔ نہایت خوش طبع اور پر گو شخص تھے۔ چونکہ المونیم کی دیگچی، پتیلی، چمچے اور رکابیاں بھی فروخت کرتے تھے۔ برتنوں کی مناسبت سے اپنے دوستوں کو مخصوص انداز میں اس طرح مخاطب کرتے ''آیئے پیندوے صاحب، آج کہاں غائب ہو گئے تھے۔ اخبار لینے بھی نہیں آئے''۔ فوق کریمی

سرائے حکیم سے تقریباً روز ہی بالائے قلعہ تشریف لاتے تھے۔ ہفت روزہ اخبار نکالتے تھے۔ سنجیدہ صحافی اور عمدہ شاعر تھے۔ شبابیات اُن کا خاص مضمون تھا۔ محبوب کے بدن کی ایسی زندہ اور تابندہ تصویر کھینچتے کہ سننے والوں کے جذبات برانگیختہ ہوجاتے۔ موصوف فحشیات میں بھی خاصہ دخل رکھتے تھے۔ لکھنو والے استاد شاعر رفیع خان کے بے شمار اشعار یاد تھے۔ علی گڑھ کے پی۔ ایچ۔ ڈی تھے۔ وضعداری کا یہ عالم تھا کہ ہمارے لکھنؤ منتقل ہونے کے بعد جب بھی ادھر آنکلتے ہم سے ضرور ملتے اور گھنٹوں صحبت رہتی۔ ابھی دو تین برس قبل ہی اپنے پیاروں کو داغ مفارقت دے گئے۔

محمود آفندی، غوث صاحب، امانت اللہ اسیر گاہے بگاہے محمد علی روڈ کے چکر لگاتے ہوئے دیکھے جاتے۔ ہاں جمال صاحب کا ذکر چھوٹا جارہا ہے۔ ہفت روزہ شباب نکالتے تھے۔ پرچہ لیتھو پر چھپتا تھا، فلمی صفحہ بھی دیتے تھے۔ جس پر سرخ، نیلی، پیلی پینسلوں سے مرقع کشی کرتے رہتے۔ خاصہ دِقّت طلب اور مشکل کام تھا، مگر گرمیِ شوق اور جنون خیزی بھلا کہاں ہار مانتی ہے۔ موصوف بمبئی رہ آئے تھے۔ جدّن بائی کی قربت حاصل رہی تھی۔ عمرِ رفتہ کو آواز دیتے رہتے۔

آئے دن جگہ جگہ شعری نشستوں کے انعقاد سے گرمیِ بزمِ سخن جاری رہتی۔ آل انڈیا مشاعرے بھی بڑے اہتمام سے ہوتے تھے۔ ابر احسنی گنوری، جگر مرادابادی جیسے یکتائے فن ان مشاعروں کی رونق و زینت بڑھاتے۔ حاجی نذیر، سعید شبیر، حاجی عظیم اللہ، حاجی ایوب، حاجی نصیرالدین وغیرہ تالوں کی دنیا کا بڑا نام تھے۔ تہذیبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے، روپے کی ریل پیل تھی۔ چندے کی ایسی بارش ہوتی کہ مانگنے والوں کے گھر بھر جاتے۔ ہر سال سیرت النبی کے جلسے بڑے تزک و احتشام سے انجام پذیر ہوتے۔ سیرت کمیٹی کے سیکریٹری لودی صاحب تھے۔ پرانی وضع کے بزرگ، شیروانی علی گڑھ کٹ پجامہ اور موٹے شیشوں کی عینک جو ناک پر ٹکی رہتی، اُن کی شخصیت کا لازمہ تھی۔ اخبار بینی کے عاشق تھے۔ سیاست جدید کانپور الجمعیۃ دلی اور روزنامہ دعوت دلی ہمیشہ دربغل ہوتے۔ خوبصورت لونڈوں کے ساتھ بیحد خوشدلی سے

پیش آتے۔ ملائی دار چائے کے ساتھ ماسٹر دودھ والے کا مشہور گاجر کا حلوہ حاضر کرتے جس کی سارے شہر میں دھوم تھی۔ اردو اور فارسی کے اشعار کا برجستہ استعمال کرتے تھے۔ تھوڑی بہت ترکی بھی جانتے تھے۔ غرض کہ اشعار کے پردے میں اپنا مدعا اس خوبی سے بیان فرماتے کہ معشوقِ طرحدار ان کی سخن سنجی اور سخن فہمی پر ایمان لے آتا۔ بلکہ بے دام و درم ان کے دام میں آجاتا۔ لودی صاحب کا کمال یہ تھا کہ تہذیب وشائستگی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ حضرت بازیگر تو تھے مگر کھلا دھوکا نہ دیتے تھے۔ میاں خوشدلی کے سودے تھے اور وہ بھی غیر مشروط! کسی زمانے میں پرانے لیگی رہ چکے تھے۔

سیرت النبی کے جلسوں میں مولانا بدرالدجیٰ صاحب کلکتہ سے ضرور تشریف لاتے۔ نہایت شستہ انگریزی میں حضور اکرم کی شخصیت پر روشنی ڈالتے اور اختصار سے اردو میں ترجمہ کرتے جاتے۔ مظفر وارثی پاکستان سے تشریف لاتے تھے۔ حمد و نعت کہنے میں آپ کو ملکہ حاصل تھا۔ آواز میں اس بلا کا سوز تھا کہ ہزاروں کا مجمع سبحان تیری قدرت کے تعریفی کلمات سے آسمان سر پر اٹھالیتا۔ مولوی عبدالقیوم صاحب منٹو سرکل اسکول میں دینیات کے استاد تھے۔ آخر میں سیرتِ نبوی کے گوشوں کو اس طرح اُجاگر کرتے کہ لوگ عش عش کر اُٹھتے۔ ان دنوں علی گڑھ کے مفتی اعظم ہیں۔ قرآن کریم کی آیتوں کی تفسیر کے ساتھ ساتھ مختلف احادیث کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر اس سلاست وشستگی کے ساتھ بیان فرماتے کہ تصویر کی صورت لوگوں کے دلوں پر نقش ہو جاتا۔

ریاض ہند پریس کے مالک شجاعت علی خاں صاحب لیتھو کی چھپائی کے ماہر تھے۔ ایسی روشن چھپائی پورے شہر میں کہیں نہیں ہوتی تھی اور پھر کم خرچ بالانشیں! ہم نے عشرت امیر کے ساتھ مل کر ''ننھے منے'' ماہنامہ جاری کیا، شجاعت چچا نے اُسے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔ ہمارے والد کے دوستوں میں تھے۔ مجلسی آدمی تھے۔ شام کو پھڑ لگتی تھی اکثر وہ حاجی نورالدین کی دوکان پر نظر آتے۔ حاجی جی کی بسکٹوں کی دوکان تھی۔ مور چھاپ بیڑی کی ایجنسی بھی تھی۔ جمعہ کی نماز کے بعد وہ نمازیوں کے درمیان مفت بیڑیاں تقسیم کرتے تھے۔ جس کا ثواب یا عذاب ان کی گردن پر رہتا ہوگا۔ صبح فجر

کے بعد لوگ مکھن مٹری کا ناشتہ کرنے ان کی دوکان پر ضرور آتے تھے۔ مٹری میدے گھی اور انڈوں سے تیار کی جاتی تھی۔ یہ علی گڑھ کا مخصوص بسکٹ تھا۔حد یہ ہے کہ یونیورسٹی کے سبھی ہاسٹلوں میں دو مٹری، ایک مکھن کی ٹکیا اور دو کپ چائے کا ناشتہ مخصوص تھا۔ایک صاحب جو جثے کے اعتبار سے تو پہلوان تھے مگر مشہور ڈاکٹر کے نام سے تھے۔ اصل میں لذیذ ترین مٹری بنانے میں اُن کی شہرت کے ڈنکے چار کھونٹ بج رہے تھے۔ آس اولاد تھی نہیں۔ اصلی گھی اور انڈوں کے علاوہ ترنگ میں ہوتے تو زعفران بھی میدے میں شامل کر لیتے۔ بھانگ کے شوقین تھے۔ سلوکا پہنے کھرّی چارپائی پر بیٹھے رہتے تھے۔ آنکھیں سرخ انگارہ رہتیں۔ عیب اپنی جگہ پر، لوگوں کے فائدے میں تو تھے۔نقصان کبھی نہ کیا۔ گاہکوں کے ساتھ محبت سے پیش آتے۔ بھولا بھٹکا مسافر ان کے یہاں سوالی بن کر کھڑا ہو جاتا تو اس کی شکم سیری کا اہتمام کرتے اور روپے دو روپے بھی ہاتھ پر رکھ دیتے۔ہم آتے جاتے تنور میں سینکی ہوئی سرخ مٹریاں دیکھتے تو منھ میں پانی آجاتا۔ڈاکٹر صاحب ہمیں بڑے پیار سے بلا کر مکھن لگی گرم گرم مٹریاں چائے کے ساتھ کھلاتے اور خوش ہوتے۔ ہمارے ابا کوتوالی میں افسر تھے۔اُن کا دبدبہ بھی کام آتا تھا۔ ڈاکٹر کے علاوہ بھورے خاں بھی بہت عمدہ مٹریاں تیار کراتے تھے۔ ڈاکٹر اور بھورے خاں کے بیچ ہوڑ لگتی تھی کہ دیکھیں کون زیادہ اچھی مٹری تیار کرتا ہے۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے نہ رہے۔

ہمارے زمانے میں ریڈیو سیٹ کم کم دستیاب تھے۔اکثر لوگ خبریں سننے کے لیے ہوٹلوں میں چائے کی پیالی پر نشست جماتے۔ حالات حاضرہ پر تبصرے سے قبل خبریں سنی جاتیں۔ ہندوستان، پاکستان کے درمیان پہلی ٹیسٹ سیریز غالباً ۵۳-۵۴ء میں ہوئی تھی۔اُن دنوں ریڈیو پر انگریزی میں لائو کمینٹری ہوتی تھی۔ وزیا نگرم اور طالع یار خاں انگریزی میں آنکھوں دیکھا حال سناتے تھے۔ وجے مرچینٹ، وجے ہزارے، وجے منجریکر، پھدکر، رام چندر، لالہ امرناتھ، مشتاق احمد، پولی امریگر ہندوستان کی نمائندگی کرتے تھے۔ ایک ذرا بعد ناری کنٹریکٹر، رما کانت دیسائی، جے سمہا، فاروق

انجینئر، سلیم درّانی، عباس علی بیگ، بابو ناد کرنی، چندر شیکھر، منکڈ، چندو بورڈے، بالو گپتے وی۔ وی کمار، کرپال سنگھ، ہنومنت سنگھ کرکٹ کی دنیا میں نامور کھلاڑی بن چکے تھے۔ عثمانیہ کے مالک یٰسین بھائی اور ان کے قریبی عزیز عثمان پتنگ والے کمنٹری کے عاشق تھے۔ گو کہ انگریزی زبان سے نابلد تھے مگر کھیل کے جانکار تھے اور کھیل سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے تھے۔ حیفظ کاردار پاکستان کرکٹ ٹیم کے کپتان کی حیثیت سے نمائندگی کر رہے تھے۔ حنیف محمد، وزیر محمد، نذر محمد، وقار، فضل محمود، امتیاز احمد، سعید احمد، محمود الٰہی، پاکستانی کرکٹ ٹیم کے ستاروں میں شمار ہوتے تھے۔ والس متھائی بھی پاکستان کی نمائندگی کر چکے تھے۔ مدثر نذر، جاوید میاں داد، انتخاب عالم، صادق محمد، مشتاق محمد ذرا بعد میں روشن ہوئے۔ عثمانیہ میں کمنٹری سننے والوں میں ہم بھی پیش پیش رہتے تھے۔ یونیورسٹی میں شعبۂ کامرس کے لیکچرر حفیظ صاحب بھی سوٹ بوٹ پہن کر کمنٹری سننے آتے تھے۔ نہ جانے کیوں لوگ انہیں حفیظ کچّے کے نام سے پکارتے تھے۔ بعد میں وہ پروفیسر اور ڈین فیکلٹی آف کامرس ہوئے۔ بزنس ایڈمنسٹریشن کا ڈپلوما کورس بھی آپ ہی نے انٹروڈیوس کرایا۔

محمد علی روڈ کی ٹوپوگرافی بیان کر رہے تھے۔ قصہ طولانی ہوا جاتا ہے کرکٹ کو خیر باد کہتے ہوئے کوئی اور افسانہ چھیڑتے ہیں، ماسٹرِ دودھ والے کا ذکر اک ذرا تفصیل چاہتا ہے۔ وہ اپنے خالص دودھ، ماوے، گاجر اور انڈے کے حلوے کے علاوہ گرمیوں میں لسّی کے لیے بھی مشہور تھے۔ یونیورسٹی کے طالب علم جوق در جوق چلے آتے تھے۔ لسّی میں روح افزا بھی شامل ہوتا تھا اور بالائی کی آمیزش بھی۔ اُن کے بنائے ہوئے پیڑوں کی بھی شہر میں دھوم تھی۔

بقر عید کے لیے ماسٹر دودھ والے بڑے پیار سے بکرے پالتے اور پورے سال انہیں اخروٹ، بادام اور کشمش کھلاتے۔ آمدنی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ کارِ خیر میں دونوں ہاتھوں سے لٹاتے تھے۔ کسی مسجد کے متوَلّی بھی تھے۔ انتقال سے پہلے اپنا سارا اثاثہ مسجد کے نام کر گئے۔

محمد علی روپ پر واقع آتش بازوں کی مسجد میں ضرّ ارمیاں کا ڈیرا تھا۔ اُن کے بے شمار معتقدین تھے جو مسجد میں نماز کے لیے داخل ہوتے ہی اُن کے ہاتھوں کو عقیدت سے چومتے اور آنکھوں سے لگاتے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ان کے قبضۂ قدرت میں جن ہیں۔ وہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے عامل بھی ہیں۔ بیماروں اور معذورں کو دعائیں دیتے۔ دم کرتے، آب زم زم پلاتے اور اُن کی مشکلیں آسان ہوجاتیں۔ محفل سماع کے شوقین تھے۔ کٹ پلے پر واقع بابا برچھی بہادر کے مزار پر ہر سال قوالیوں کا اہتمام کیا جاتا۔ جس کے اہتمام و انتظام میں ضرار میاں پیش پیش رہتے۔ نئی بستی کے طاہر میاں اُن سے بیعت تھے۔ یونیورسٹی میں ملازمت کرتے تھے۔ وہ بطور خادم پورے سال عُرس کی تیاریوں میں لگے رہتے۔ ہندوستان، پاکستان کے نامور قوال حضرت برچھی بہادر کے دربار میں حاضری دے کر نذرانۂ عقیدت پیش کرتے۔ حبیب پینٹر قوال زندہ تھے۔ اُن کے قول ترانے سے قوالی کی محفل کا آعاز ہوتا۔ اُن کے گلے میں راگنی بسیرا کرتی تھی۔ کیا گمک دار آواز تھی ایسی لے کاری کرتے کہ لوگوں پر وجد کی کیفیت طاری ہوجاتی۔ مکھن والے باؤجی کو حال آجاتا، جن کے گائے چھاپ مکھن کی پورے شہر میں دھوم تھی۔ ضرار میاں کسی قوّال سے خوش ہوجاتے تو نوٹوں کی لین ڈوری لگادیتے، اُن کی جیب سے نوٹ نکلنا شروع ہوتے تو یہ سلسلہ فجر کی اذان سے پہلے تک جاری رہتا اور اُن کی جیب تھی کہ بھری کی بھری رہتی۔ اپنی ماں کا پلّو تھامے ہم بھی اس محفل سماع میں شریک رہتے۔ بابا برچھی بہادر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جلالی بزرگ تھے۔ ''انگریز بہادر'' جب ریل کی پٹریوں کا جال بچھا رہے تھے تو انہوں نے پوری عقیدت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کے مزار سے خاصہ فاصلہ برقرار رکھ کر ریل کی پٹریاں بچھوائیں۔

✪✪✪✪

یہ میرا چمن ہے

جن دنوں ہم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طالب علم تھے۔ معید خاں صاحب ڈیوٹی سوسائٹی کے سکریٹری ہوا کرتے تھے۔ سوسائٹی ضرورت مند طلباء کو امتحان سے قبل قرض فراہم کرتی تھی۔ اس کے لئے طالب علم کو بہ نفس نفیس معید خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ معاشی تنگ دستی کے جائزے کے لئے وہ چند سوالات قائم کرتے اور مطمئن ہوکر درخواست پر صاد کر دیتے۔ ایک بار ہم بھی مسمسی صورت بنا کر جناب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی مظلومیت کا رونا شروع کر دیا کہ اگر ہمیں سوسائٹی نے قرضہ فراہم نہ کیا تو ہمارا ہال ٹکٹ روک دیا جائے گا اور ہم امتحان کی مطلوبہ فیس کی عدم ادائیگی کی بنا پر شرکت سے محروم کر دیئے جائیں گے''۔

خان صاحب نے ہماری روئیدادِ غم کو بڑی دلچسپی سے سنا، اپنی سفید ٹوپی کو سر پر جمایا، شیروانی کے بٹنوں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوئے۔

''میاں! کیا تھیئٹر میں جانے کا ارادہ ہے اچھی بھلی اداکاری کر لیتے ہو۔''

ہم نے خفیف ہوکر سر جھکا لیا سچ تو یہ ہے کہ ہم ضرورت مند تھے ہی نہیں۔ ہم جلدی سے سلام کر کے اُٹھنا ہی چاہتے تھے کہ خان صاحب نے ہمارے گال کو ہلکے سے تھپکی دی اور پھر گوشمالی کرتے ہوئے ہماری درخواست پر دستخط ثبت کر دیئے۔ مبلغ بیس روپے کا قرض حسنہ عطا کر دیا گیا تھا۔ ہم شکریہ ادا کر کے جانے لگے تو انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔'' نہ جانے، کتنے جرنل، کرنل، ایڈمنسٹریٹر اور سائنٹسٹس (Scientists) ڈیوٹی سوسائٹی سے قرض لے کر بھولے بیٹھے ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ تم کیا روشِ اختیار کرتے ہو''۔

اور ہم نے بھی وہی کیا جو ہمارے اگلوں نے کیا تھا۔

✪✪✪✪

حدیث اورفقہ کے عالم پروفیسر عبدالعزیز میمن شعبۂ عربی کے سربراہ رہ چکے تھے۔ہم اُن کے نام نامی سے کماحقہ آشنا تھے۔ بعد میں وہ پاکستان مراجعت کر گئے۔ اُن کے صاحبزادے محمد عمر میمن ہماری یادوں میں پوری طرح روشن ہیں۔ ہمارا ان سے تعارف ماہِ نو کراچی کے ذریعہ ہوا تھا جس کے مدیر رفیق خاور اُن کے افسانوں کو نہایت اہتمام سے شائع کرتے تھے۔ ایک اور ممتاز افسانہ نگار ضمیرالدین احمد نے بھی اپنی شناخت ماہ نو ہی سے بنائی تھی جو بعد میں لندن منتقل ہو گئے۔

محمد عمر میمن امریکا میں ہیں اور اُردو اسٹڈیز کے نام سے انگریزی میں ایک ضخیم رسالہ نکالتے ہیں۔ انہوں نے نیّر مسعود کی منتخب کہانیاں ''عطر کافور'' The Essense of Camphor کے نام سے انگریزی میں منتقل کی ہیں۔ ہماری اردو کہانی ایک رات کی جنت بھی وہ اپنے موقر جریدے میں شائع کر چکے ہیں جس کا ترجمہ ہمارے مرحوم دوست ڈاکٹر جلیل کی صاحبزادی رخشندہ جلیل نے کیا تھا۔ اتفاق سے ان سبھی لوگوں کی آرائش وزیبائش میں ہماری مادر درسگاہ دانش کدۂ علم وفن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ہاتھ ہے۔

استاذی محترم پروفیسر امرالدین کا ہم پہلے کہیں ذکر کر چکے ہیں، اچانک شعور کی چنگاری جاگی اور اُن کے تعلق سے ہمیں صلاح الدین محمود کا خیال آ گیا بھلا اُنہیں فراموش بھی کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے ذکرِ خیر کے بغیر تو ہمارا زندگی نامہ بے رنگ ہی رہ جاتا۔ وقت کی آندھی اُنہیں اُڑا کر پاکستان لے گئی، مگر علی گڑھ کول اُن کی یادوں کی کائنات سے کبھی جدا نہ ہو سکا۔ مرتے دم تک وہ علی گڑھ کے پھوس بنگلے، ڈک روڈ، مسعود محل ویمنز کالج اور میرس روڈ میں واقع خلیل منزل کی سہانی یادوں کی جوت جگاتے رہے، جہاں انہوں نے اپنا بچپن اور لڑکپن گزارا تھا علی گڑھ چھوڑتے وقت وہ اپنا ماضی بھی ساتھ لے گئے تھے۔

''مولسری پر کبھی خزاں آتی تھی اور ہم جالیوں کے پاس مسجد کی باہر والی دیوار کے ساتھ کان لگا کر اپنے پیاروں کے دلوں کی دھڑکن سنتے تھے۔ زمین کی گہرائیوں میں پوشیدہ روشنی میں آ کر نکھر جانے والے پانی کی بے قراری کو اپنے لہو میں محسوس کرتے تھے۔ مولسری کے نیچے مسجد کے پچھواڑے سرسید احمد خاں کی قبر کے سرہانے دیوار کی دوسری طرف واقع اس چھوٹے سے تالاب میں پانی ہر دم بدلتا رہتا تھا۔۔۔'' (سرسید احمد خاں: لمحے کی داستان)

''۔۔صلاح الدین محمود شدید مذہبی انسان تھے مگر وہ روائتی مذہبی لوگوں سے قطعی مختلف تھے۔ انہوں نے اپنی ذات میں عقیدت مندی کے ایسے احساسات کو پروان چڑھالیا تھا جو صرف انہی کا حصہ تھے۔ وہ ایک ایسی جذباتی معراج کی دلی تمنا رکھتے تھے جو انہیں ان مقدس لمحات میں جینے کا موقع فراہم کر سکے جن میں نبی کریم اس دارفانی میں سانس لے رہے تھے۔ اُن کے خیال میں وہ اس زمین پر وقت کی سبک رو لہر کی پاکیزہ ترین ساعتیں تھیں۔ وہ اسی فکر میں غلطاں رہتے تھے کہ کاش اُنہیں پاکیزہ ساعتوں میں سانس لینے کی سعادت حاصل کر سکیں۔

۔۔۔انہوں نے بالکل ایسی ہی تعظیم و تکریم کے ساتھ بھگتی عہد کی عقیدتمندانہ شاعری کا مطالعہ کیا تھا۔ اُن کے نزدیک میرا بائی ایک نہایت قابلِ احترام ہستی تھی۔ اُس کی شاعری اُن کے خیال کے مطابق عشق اور عقیدت مندی کی معراج تھی۔'' (انتظار حسین کے مضمون سے اقتباس)

سچ تو یہ ہے کہ علی گڑھ کے اس ہنرمند ہمہ جہت فنکار نے شش جہات زندگی سے لازوال عشق کیا۔ بقول شمیم حنفی ''انہوں نے جو دنیا لفظوں سے تعمیر کی۔ اسکی پہچان کے لئے ہمیشہ اُنہی سے رجوع کرنا ہوگا کیوں کہ اُن کی سب سے بڑی زرخیز اور زندہ تخلیق خود ان کی اپنی ذات تھی''۔

✪✪✪✪

پروفیسر خفی کا ہم پہلے بھی کہیں ذکر کر چکے ہیں۔ ایک دن کلاس روم میں اُن کے

ساتھ ایک دبلے پتلے پستہ قد شخص کو دیکھا جس نے نہایت عمدہ سوٹ پہن رکھا تھا اور منحنی ناک کے بانسے پر سنہری فریم کی عینک ٹکی ہوئی تھی۔ اس دن خصوصی طور پر اُن کے لیکچر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تعارفی کلمات میں پروفیسر حقّی نے بزبان انگریزی فرمایا۔

"یہ ہم سب کے لئے نہایت فخر کی بات ہے کہ پروفیسر نیرد سی چودھری ماہر عمرانیات ہمارے درمیان موجود ہیں۔

نیرد چودھری نے معذرت آمیز لہجہ میں تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

"Thanks for the compliments, however I am not a professor"

بنگال کا یہ "بھدر پُرش" مستقل طور پر لندن میں اقامت پذیر تھا اور جب وہ عمر کے نینانوے (۹۹) پڑاؤ سے گزر رہا تھا۔ Three horse men of the new apocalypse جیسی غیر معمولی کتاب زیرِ تخلیق تھی جس میں انسان اور کائنات کے باہمی رشتوں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے تہذیبوں کے ارتقا اور اُن کے زوال کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

خیر یہ تو مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات

ہم اپنے قارئین کو پھر کلاس روم میں لئے چلتے ہیں۔ اپنے لیکچر میں نابغۂ روزگار سیاسی مفکر اور فلسفی نے ہمیں بتلایا کہ انہوں نے اپنے کیرئر کا آغاز آل انڈیا ریڈیو دلی میں انگریزی کے اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے کیا اور وہ صبح سویرے اپنی پرانی سائکل پر دفتر کے لئے روانہ ہوجاتے تھے۔ سائکل کے انجر پنجر ڈھیلے ہو چکے تھے، راستے بھر بارہا چین اُترتی تھی اور وہ سائکل سے اُتر کر بار بار چین چڑھاتے تھے۔ غرض کہ یہ سلسلہ دفتر پہنچنے تک جاری رہتا تھا۔ یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگے۔ کسی طالب علم نے شوخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُن سے دریافت کیا کہ اُن کی پیدائش کب ہوئی تھی اور نہوں نے لکھنا کب شروع کیا تھا۔

پروفیسر چودھری نے برجستہ جواب دیا "جس سال ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی منائی جارہی تھی۔ اُسی سال وہ تولّد ہوئے تھے۔ لکھنا کب شروع کیا۔ یہ تو یاد نہیں ہاں اتنا

ضرور جانتا ہوں۔ ۱۹۲۵ء میں میری ''متنازعہ فیہ'' چیزیں چھپنا شروع ہوگئی تھیں۔ حالانکہ میں کبھی کسی تنازعہ میں شامل نہیں ہوا۔ نہ میں نے کبھی گالیوں بھری تنقید کا جواب دینا مناسب سمجھا۔ میرا یہ ماننا ہے کہ لکھنے والے کو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہیے اگر اُس نے بھول کر بھی ایسا کیا کہ مخالفت اور مخاصمت کے جواب میں وقت ضائع کیا تو وہ نہ صرف لکھنے کے مزے اور پاکیزہ مقصد سے بھٹک جائے گا۔ اُس کے طبع زاد خیالات گنجلک ہو کر اپنی موت آپ مرجائیں گے۔ یہ درست ہے کہ کوئی بھی خیال اپنے آپ میں قیمتی نہیں ہوتا اور متحارب خیال کو جنم دیتا ہے۔ جیسا کہ سنسکرت میں ایک کہاوت ہے دنیا میں ایسا کوئی سادھو نہیں جس کے عقائد (خیالات) دوسرے سادھوؤں سے مختلف نہیں ہوتے۔''

آج سے نصف صدی قبل اس عظیم ترین مفکر سے ہماری پہلی اور آخری ملاقات ہوئی تھی جو آج بھی ہمارے شعور میں چنگاری کی طرح روشن ہے۔ نیرد چودھری کو شہرت دوام اُن کی کتاب A Passage to England سے حاصل ہوئی جو انہوں نے ای۔ ایم فورسٹر کی مشہور زمانہ کتاب A Passage to India کے جواب میں لکھی تھی۔ ہندو مذہب پر اُن کی غیر معمولی تخلیق Hinduism A Religion To Live By بھی تزکیہ نفس کے لئے سرمایۂ حیات ہے۔

✪✪✪✪

علی گڑھ یونیورسٹی میں نو برس گزارنے کے بعد پوری طرح آدمی بننا تو ممکن نہ ہوسکا۔ پتہ نہیں یہ ہماری بدنصیبی تھی یا خوش نصیبی۔ اس بارے میں بھی کوئی حتمی فیصلہ کرنا دشوار نظر آتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہزار دشواریوں کے باوجود رزم گہہ حیات میں دل ناتوان نے مقابلہ تو خوب کیا ہمیں خودستائی کے لئے معاف فرمائیں ہم کیا اور ہماری اوقات کیا لیکن جس میدان میں قدم رکھا بازی مار کر آئے۔ عبادت، شجاعت، امامت، قیادت اور ریاضت کی انتہا کر دی۔ اچھا برا جو بھی کیا، پورے ذوق وشوق اور دلجمعی کے ساتھ کیا۔ یہاں ذرا برے کی وضاحت کر دیں، ظاہر بُرا تھا لیکن باطن میں ضمیر

کی شمع ہمیشہ روشن رہی! خدا کے علاوہ کبھی کسی کے سامنے خفیف نہ ہوئے۔ ہماری ماں کہتی تھی ''بیٹا تیری پیٹھ پر علی کا پنجہ ہے یہ اس بات کی نشانی ہے کہ تیری پیٹھ کبھی زمین سے نہ لگے گی۔'' وہ تو واصلِ جنت ہوئی مگر اُس کا عقیدہ زندہ ہے۔

لو بھئی ہم بھی کہاں دون کی لینے لگے اصل بات چھوٹی جاتی ہے۔ ہم جب یونیورسٹی کے حدود اربعہ میں داخل ہوئے تو ذاکر صاحب سرسید کے لگائے اس پودے کو اپنے خون جگر سے سینچ رہے تھے، جسے تاریک پسندوں کا انبوہ کثیر حرفِ غلط کی طرح مٹانے پر تلا ہوا تھا۔ ذاکر صاحب سے پہلے سرضیاالدین نے آندھیوں میں چراغ جلائے رکھا۔ ذاکر صاحب گئے تو کرنل بشیر حسین زیدی آگئے، نہایت جہاندیدہ، چشیدہ کشیدہ آدمی تھے، وقت کے بدلتے ہوئے تیوروں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ریاست رام پور میں وزارت عظمیٰ کا تاج پہن چکے تھے۔ سیاست کے نبض شناس تھے۔ علم کے جویا اور عالموں کے قدردان تھے۔ اُن کی بیگم قدسیہ زیدی تھیٹر اور ادب سے گہری وابستگی رکھتی تھیں ہم نے اُن کا ترجمہ کیا ہوا کالیداس کا ڈرامہ پڑھا تو جی خوش ہو گیا۔ بابا نیاز حیدر کی شیدائی تھیں اور اُن کی بے پناہ قدر کرتی تھیں۔ بعد میں شکنتلا اسٹیج کیا گیا۔ طفیل صاحب کے سنیما گھر تصویر محل میں یہ ڈرامہ اسٹیج پر کھیلا گیا۔ شکنتلا کا رول اُن کی بیٹی شمع زیدی نے ادا کیا تھا۔ ڈرامہ دیکھ کر ہمیں ایسا لگا جیسے صدیوں پرانا حیرت زا رُومان ماضی کی ردا چھوڑ کر حال میں جی اُٹھا ہو۔ کوئی چالیس برس بعد ممبئی کے ایک ادبی مجمع میں شمع زیدی کو ہم نے دیکھا، تو ہمارے بطون میں شکنتلا ایک بار پھر جی اُٹھی۔ معاذ اللہ پرانے دن بھی کیا دن تھے۔ جب صبح و شام ساون جھومتا تھا۔ پپیہا کی پی ہو پی ہو کی آوازیں فضا کو رنگ و نور سے بھر دیتی تھیں:

ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی
مۂ رنگین تھا سادہ پانی بھی

ذکر ہو رہا تھا بزرگی کا اور بات جا پہنچی جوانی تک! کرنل بشیر حسین زیدی محض علم و ادب کے رسیا نہ تھے وہ سیاست کے مردمیدان ہونے کے ساتھ ساتھ شاہجہانی خمیر و

ضمیر بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے یونیورسٹی کو بڑی مشاطگی کے ساتھ دُلہن کی طرح سنوارنے اور سجانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ چھوڑا، کینڈی ہاؤس، مولانا آزاد لائبریری، آرٹس فیکلٹی جیسی نادر و نایاب عمارتوں کو دیکھ کر قرطبہ، قاہرہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیوں کی یادتازہ ہوجاتی ہے۔ یاپھر ہندایرانی اسلوبِ تعمیر کے دریچے روشن ہوتے چلے جاتے ہیں(اس کلیہ کوآپ ہمارے ذوق جمال سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں)

اب آیئے ایک اور شیخ الجامعہ کاذکر ہوجائے، آپ ہیں بدرالدین طیّب جی آئی۔سی۔ایس کیانفیس اورنستعلیق آدمی تھے۔محض بے بدل منتظم ہی نہیں فنون لطیفہ کے عاشق بھی تھے، شجاعانہ طبیعت کا یہ عالم تھا کہ گھوڑسواری کے دلدادہ تھے اور راسیں کسناخوب جانتے تھے۔بیگم صاحب لڑکوں کے ساتھ تہذیبی سرگرمیوں میں شانہ بشانہ شریک ہوتیں۔ اسٹوڈنٹس یونین کے سالانہ جلسہ میں بصیراحمد خاں کو انہوں نے سال کے بہترین ڈبیٹر (Debator)اورہمیں بہترین رائٹر کی سند سے سرفراز کیاتھا۔اُس لمحہ کا احساس افتخاربن کرآج بھی ہمارے لہو میں دوڑ رہاہے۔ سچ تو یہ ہے کہ طیّب جی کا زمانہ یونیورسٹی کی تہذیبی اور تعلیمی سرگرمیوں کے اعتبار سے دورِ زرین کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

اب آخر میں ہم اپنے مرحوم دوست حلیم کے ابّو جان ڈاکٹرعلیم صاحب کا ذکر کرتے چلیں، تمہیداً ہم عرض کرناچاہیں گے کہ ذکااللہ روڈ پر ہم اکثر یونیورسٹی کے روائتی لباس میں ایک صاحب کوچہل قدمی کرتے ہوئے دیکھتے تھے۔ چہرے مہرے سے وہ کوئی افغانی پٹھان دکھتے تھے۔ بس ذرا قد سے مارے گئے تھے ورنہ ہماراتخیّل انہیں فرنٹیئر کے علاقوں میں لے اڑتا اور ہم اُن کے حسبی نسبی ڈانڈے سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان سے ملانے میں ذرا تاخیر نہ کرتے۔ مگر جس شے نے ہمارے تخیّل پر قدغن لگایا وہ اُن کی قدکاٹھی سے زیادہ منھ میں دباہوا سگار تھا۔

ہمارے استفسار پر ہمارے ہمدم دیرینہ غالباً رضاامام نے بتلایا کہ ''یہ ڈاکٹرعلیم ہیں شعبۂ عربی کے پروفیسر، غازی پور کے مردم خیز خطّے سے آپ کا تعلق ہے۔ لکھنؤ سے

تشریف لائے ہیں۔ غالی قسم کے ترقی پسند ہیں۔''

نام سنتے ہی ہماری عقل پر پڑا ہوا پردہ اُٹھ گیا۔ اور علیم صاحب کی تصویر روشن ہوتی چلی گئی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل اور اُس کے منشور کی تیاری میں 'ملک راج آنند، علیم صاحب اور سجاد ظہیر نے کلیدی رول ادا کیا تھا اب اُن کی شخصیت کا ایک اور پہلو ملاحظہ فرمایئے۔ ایک نیم مذہبی نیم سیاسی جماعت کے سہ روزہ اخبار کا نمائندہ اُن کا انٹرویو لینے آیا، عالم باعمل کے سامنے اُس کی ایک نہ چلی۔ ہزیمت اور شکست کے احساس کو مٹانے کے لیے' اُس نے آخری سوال داغا۔

''مذہب کے بارے میں آپ کے عقائد کیا ہیں۔''

''مجھے میرے عقائد کے بجائے میرے عمل سے جانچیے۔''

باذوق قارئین اس امر سے ضرور واقف ہوں گے کہ علیم صاحب نے ولہوزن کے اعتراضات کے جواب میں سیرت نبوی پر ایک دستاویز تحریر کی ہے وہ اپنے غیر معمولی تحقیقی مقالے ''عقیدۂ اعجاز قرآن کی تاریخ'' کے لیے بھی یاد رکھے جائیں گے۔ انگریزی، اردو، فارسی، جرمن، چینی، فرنچ، عربی اور روسی زبانوں پر انہیں قدرت حاصل تھی۔ ہندی اور سنسکرت پر بھی اُن کی گہری نظر تھی۔ وہ تاجیک زبان کے بھی اداشناسوں میں تھے۔

✪✪✪✪

خود فراموشی کے لئے معذرت طلب ہیں۔ زیدی صاحب کی ذات بابرکات کا فوقی پہلو تو رہا جا رہا تھا۔ کرنل بشیر حسین زیدی کی بلند نگہی اور مستقبل شناسی کا اعتراف بھی ضروری ہے۔ گوکہ علی گڑھ میں میڈیکل کالج قائم کرنے کا خیال پہلی بار سرضیاالدین کے ذہن میں اُس وقت آیا تھا جب وہ ۱۹۴۱ء میں دوسری بار وائس چانسلر ہوئے تھے۔ اُن کے اس مثبت خیال کو تقویت عطا کرنے والوں میں آغا خان پیش پیش تھے۔ یونیورسٹی میں پڑھنے اور پڑھانے والے کالج کے لیے چندہ کرنے کی مہم میں نہایت جوش و جذبہ کے ساتھ شریک ہوئے۔ بقول نسیم انصاری جو چندہ ہوا اس میں ہاتھوں کی

چوڑیاں، کانوں کی بالیاں اور ریزگاری کے سکّے بھی شامل تھے۔ آغا خان نے اپنی جیب خاص سے ایک لاکھ روپے کی خطیر رقم مرحمت فرمائی تھی۔

۱۹۴۶ء میں عبوری حکومت میں راجہ غفنفر علی وزیر صحت تھے، انہوں نے ریلوے لائن کے اُس پار مرہٹوں کے قلعے سے متصل زمین پر میڈیکل کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ کالج کا افتتاح فوراً اس وجہ سے نہ ہوسکا کہ کوئی مناسب آدمی پرنسپل کی جگہ کے لئے ہندوستان میں کہیں نہ ملا۔

''۱۹۴۷ء میں جو سیاسی تبدیلیاں ہوئیں ان کی وجہ سے میڈیکل کالج کا معاملہ معرض التوا میں پڑ گیا۔ اُس پر آشوب زمانے میں اگر جواہر لعل نہرو اور مولانا آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین کوشش نہ کرتے تو یونیورسٹی بچ نہیں سکتی تھی''۔

۱۹۵۶ء میں بشیر حسین زیدی وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ انہوں نے میڈیکل کالج کھولنے کے لئے جان کی بازی لگادی اور بالآخر کامیابی اور کامرانی نے اُن کے قدم چومے۔

اکتوبر ۱۹۶۲ء میں میڈیکل کالج کھل گیا اور سرضیاء الدین نے ۱۹۴۱ء میں جو خواب دیکھا تھا وہ پورا ہوا۔ محض اس ایک کارنامے کے لئے زیدی صاحب کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ سچ ہے ایسے یکتا اور دانا لوگ بار بار کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

علی گڑھ والے جانتے ہوں گے جب ۱۹۴۹ء میں ذاکر صاحب نے علی گڑھ یونیورسٹی کی باگ ڈور سنبھالی تو انہوں نے ڈاکٹر موہن لال کے ساتھ مل کر آنکھوں کی بیماری کے علاج کے لئے ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جس کا نام اے۔ ایم۔ یو آپتھلمک انسٹی ٹیوٹ رکھا گیا۔ اسی انسٹی ٹیوٹ میں ڈاکٹر سمیع حمید کا تقرر کیا گیا، جو بعد میں میڈیکل کالج میں پروفیسر اور پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب سے ہماری گاڑھی چھنتی تھی۔ ان دنوں ہم جز وقتی صحافی بھی تھے اور ہندی کے مشہور اخبار ہفت روزہ ''پراودا'' سے جُڑے ہوئے تھے۔ آنتوں میں سوزش رہتی تھی، جسے میڈیکل اصطلاح میں کولائٹس کہتے ہیں۔ آگرہ، دلّی اور علی گڑھ کے نامی گرامی ڈاکٹر نہ تو ہمارے

مرض کی صحیح تشخص کر سکے اور نہ علاج! آخر میں ہم نے ڈاکٹر سمیع حمید کے مطب میں جا کر پناہ لی۔ انہوں نے ایک نظر ہمارے چہرے پر ڈالی، مشاغل دریافت کئے اور نسخہ لکھ کر ہمیں تھما دیا۔ ہم حیرت سے اُنہیں تکا کئے۔ دو دن دواپی تو ہمارا شیطانی مرض ہوا ہوگیا ہم نے ڈاکٹر صاحب کا پروفائل (Profile) اخبار میں شائع کردیا۔ انہی دنوں ڈاکٹر صاحب پروفیسر شپ کے لئے امیدوار تھے کانپور میڈیکل کالج کے کوئی پروفیسر بھی انٹرویو کے لئے آئے تھے۔ منتخب امیدواروں کے پینل میں اُن کا نام سرفہرست تھا اور دوسرے نمبر پر ڈاکٹر سمیع حمید تھے۔ کانپور کے پروفیسر موصوف اپنے کرادر کی خامکاری کی بنا پر مسترد کردیے گئے اور قرعۂ فال سمیع حمید کے نام نکلا۔ خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی سمیع حمید تشخیص کے معاملے میں یگانۂ روزگار تھے اور آن واحد میں مریض کے مزاج اور اُس کی نفسیات کو بھانپ لیتے تھے۔ آنکھوں کے شفاخانے کے سربراہ ڈاکٹر موہن لال شدید بیمار پڑے تو سمیع حمید نے اپنے کشف و کرامات سے جاتی ہوئی سانسوں کو واپس لانے کا کرشمہ کردکھایا۔ ابھی وہ روبۂ صحت ہو ہی رہے تھے کہ اُن کے اعزّہ نے انہیں آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ دلّی لے جانے کا فیصلہ کرلیا اور سمیع حمید کی واضح تنبیہہ کے باوجود کہ دلّی کا سفر اُن کی زندگی کے لئے خطرہ بن سکتا ہے وہ نہ مانے۔ اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

ڈاکٹر سمیع حمید ماہر طبیب اور نبض شناس ہونے کے ساتھ ساتھ نفسیاتی علاج کے معاملے میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انہوں نے ہمیں ایک قصہ سنایا ایک جج صاحب اُن کے چیمبر میں داخل ہوئے ڈاکٹر صاحب نے انہیں نظر بھر کے دیکھا اور اُن سے دریافت کیا ''آپ کا پیشہ کیا رہا ہے''۔

جی میں ہائی کورٹ میں جج تھا۔

سمیع حمید نے انہیں کچھ دوائیں تجویز کیں اور نسخہ مرحمت فرماتے ہوئے آرام سے کہا۔ ''جسمانی اعتبار سے آپ بالکل ٹھیک ہیں اصل میں آپ نفسیاتی مریض ہیں اور اُس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آپ نے کئی لوگوں کو پھانسی کی سزائیں دی ہوں گی جن میں

کوئی بے قصور بھی ہوگا۔ اُسی کی مضطرب روح آپ کو خوابوں میں ڈراتی ہے۔ دوائیں تجویز کردی ہیں۔ ساتھ ہی اللہ سے رجوع کیجئے اور اُس کے مجبور بندوں سے بھی، حتی الامکان دامے درمے سخنے اُن کی مدد بھی کیجئے۔۔۔ شفایاب ہوں گے''۔

اب قول محال کی طرف بھی آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب پرہیز کے دشمن تھے۔ مریضوں کو کھلی اجازت دی تھی کہ وہ حسب منشا مرچ، تیل اور گھی کا استعمال کریں۔ خود بھی سگرٹ نوشی کے مریض تھے۔ وزن پاؤ بھر سے زیادہ نہیں تھا، چار مینا ر پیتے تھے۔ واللہ عالم بالصواب، دشمنوں کا کہنا تھا کہ منشیات کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ عورتوں کے بھی شوقین ہیں۔ لیکن فن طب میں ابن سینا اور حکیم جالی نوس کے شاگرد تھے۔ مریض روتا ہوا آتا اور ہنستا ہوا جاتا۔ ایک چندے آفتاب چندے ماہتاب ڈاکٹر اُن کے ہاتھ کے نیچے کام کرتی تھی، اس سے نکاح ثانی کرنے میں دیر نہ لگائی۔ خدا بخشے انسان خطاؤں کا پتلا ہے وہ خطا کار تھے مگر مسیحا بھی تو تھے!

✪✪✪✪

زیدی بہنیں جن کا یونیورسٹی کے ادبی حلقوں میں شہرہ تھا۔ وہ تھیں صابرہ زیدی، زاہدہ زیدی اور ساجدہ زیدی! صابرہ زیدی ماسکو چلی گئی تھیں۔ وہاں انہوں نے روسی ادیبوں کے شاہکار شگفتہ اردو میں منتقل کئے۔ زاہدہ زیدی انگریزی ادبیات کی استاد تھیں، تھیئٹر سے گہرا شغف رکھتی تھیں۔ انہوں نے اپنے طالب علموں کو تھیئٹر کے آداب سکھلائے۔ ہماری یادوں کے قافلے میں نصیرالدین شاہ کی شبیہ اُبھر رہی ہے۔ یہ علی گڑھ یونیورسٹی کے پروڈکٹ ہیں۔ اداکاری کے بیحد شوقین تھے۔ ذاتی طور پر ان سے کوئی شناسائی نہ تھی۔ اُن کا نام ضرور سنتے تھے لیکن ہم نے اُن کے چچا جان شاہ صاحب کے بہت چرچے سنے تھے۔ ہمارے ابا اکثر اُن کا ذکر کرتے تھے۔ آئی۔ پی۔ ایس افسر تھے۔ نہایت نڈر اور دبنگ! جن دنوں وہ ایس۔ ایس پی تھے اپنی بیگم صاحب کے ساتھ چاندنی پوری رات کو روضۂ تاج محل کی زیارت کو پہنچے۔ چاند کی کرنیں جب جمنا کے پانی

میں اُتر تیں تو روشنی کا جھما کا فضا میں لہرا اُٹھتا۔ لطفِ نظارہ میں شامل بعض منچلے نو جوان آواز لگاتے۔ ''چمکی، چمکی وہ چمکی''۔ چاند اور چاندنی کے حسن کی ستائش میں ضم کا پہلو نکلتا تھا۔ مجمع میں شامل خوبصورت عورتوں کی پذیرائی بلکہ حسن آرائی کے لیے آوازے کسے جاتے تھے۔ شاہ صاحب سادہ کپڑوں میں تھے۔ ایک چھوٹا سا بید اُنکے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے اپنے مختصر بید کی ایسی چمک دکھائی کہ نو جوانوں کی شوخیاں ہَوا ہوگئیں اور وہ جائے امان کی تلاش میں کنارِ جمنا کی طرف راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے دریا بُرد ہوتے ہوئے بچے۔

بات میں بات نکل آئی۔ ہم عرض تو یہ کرنا چاہتے تھے کہ نصیرالدین شاہ تھیئٹر کی سیڑھی لگا کر اداکاری کے آسمان پر جا پہنچے۔ ہم تو پرانی نسل کے ہیں نئی نسل جس میں ہمارا چھوٹا بیٹا بھی شامل ہے جو ہماری طرح اُن کا زبردست فین ہے۔ گجرات فسادات کے پس منظر میں بنی نصیر کی حالیہ فلم Parizana کی سی۔ ڈی لا کر اُس نے فلم خود بھی دیکھی اور ہمیں بھی دکھائی اور اُس کے ایک ایک فریم کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے۔ ہم دل ہی دل میں خوش ہوتے رہے کہ ہمارے صاحبزادے ہم سے زیادہ فلم کے اچھے پارکھ نکلے اور ایک علیگ کی شان میں رطب اللسان ہیں۔ ہم تو اسے زاہدہ زیدی ہی کا کرشمہ جانتے ہیں کہ انہوں نے تھیئٹر، ادب اور شاعری کی دنیا میں غیر معمولی صلاحیتوں کے افراد کی نشو ونما کی۔ جن میں نصیرالدین شاہ کے علاوہ صلاح الدین پرویز اور معنوی اعتبار سے ہم خود کو بھی شامل تصور کرتے ہیں۔

زاہدہ زیدی یونیورسٹی اور ملک کی علمی، ادبی اور تہذیبی سرگرمویں میں ہمیشہ فعال کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ مغربی اور مشرقی ادب کے علاوہ فلسفہ، نفسیات اور سیاسیات کے ساتھ ساتھ انہوں نے مختلف مذاہب پر بھی عمیق نگاہ ڈالی ہے۔ اگر کوئی ہم سے پوچھے تو انڈو پاک میں شفیق فاطمہ شعریٰ، فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید سے وہ کسی درجہ کم ممتاز شاعرہ نہیں ہیں بلکہ اُن کا قد کچھ نکلتا ہوا ہے۔ چیخف بیکٹ، ایونیسکو اور سارتر کے ڈراموں کے ترجموں کے لیے بھی انہیں ہمیشہ بہ نظر استحسان دیکھا جائے گا۔

یوں تو انہوں نے ڈھیر ساری خوبصورت نظمیں کہی ہیں جو اپنے لہجہ کی گھلاوٹ اور جذبے کی صداقت کے لیے یاد رکھی جائیں گے، دیکھیے اُن کی یہ چھوٹی سی نظم تانیثی ادب کا کتنا خوبصورت استعارہ ہے:

نطق کی پتیاں
سلوٹوں کی مہک
شعلہ اندام جسموں کی حیرانیاں
نیلی عریانیوں کی شفق
لمس کی ندیاں
قربتوں کے سمندر
تنگ غاروں کے پُر نور جھرنے
تلاطم کی چنگاریاں
نقطۂ وصل کی وسعتیں
درد کے آسماں
لفظ کی جھولیوں میں سمیٹو
ہوا تیز ہے

✪✪✪✪

سامعین کے روبرو آل انڈیا ریڈیو دلّی کی اردو سروس کی جانب سے مشاعرہ کا انعقاد کیا جارہا تھا۔ اسد بھائی کے اصرار پر ہم نے دعوت ناموں کا انتظام کیا اور وگیان بھون جاپہنچے۔ دوتین صفیں چھوڑکر ہم نے کارنر کی دوسیٹوں پر نشست جمائی اور درمیانی سیٹ خالی چھوڑ دی۔ ایسا ہم نے شرارتاً کیا تھا۔کوئی آتا تو ہم معذرت طلب لہجہ میں اطلاع دیتے یہ جگہ ہماری عزیزہ کے لیے ہے بس آیا ہی چاہتی ہیں۔ مشاعرہ کے آغاز کے کوئی آدھ گھنٹے بعد ہماری مراد برآئی۔ ایک نوخیز لڑکی نے اپنی گرم سانسوں کا دھواں چھوڑتے ہوئے نہایت مہذب لہجہ میں استفسار کیا۔کیا ہم اس خالی سیٹ پر بیٹھ سکتے

ہیں۔ہم نے جواب دیا۔ ’’نیکی اور پوچھ پوچھ، ضرور تشریف رکھئے۔‘‘

مشاعرہ شروع ہواتو ہم نے ہلکی پھلکی ہوٹنگ شروع کر دی۔ اچھے شعروں پر داد دیتے اور بُرے شعروں کو ہوا میں اُڑادیتے۔ ہمیں حیرت اس وقت ہوئی جب ہم نے دیکھا کہ وہ اجنبی لڑکی جو ہمارے اور اسد کے درمیان والی نشست پر بیٹھی ہوئی تھی۔ہماری داد اور بے داد سے محظوظ ہورہی تھی۔ اسٹیج کے ناظم نے ساجدہ زیدی کے نام کا اعلان کیا۔انہوں نے کوئی نظم سنائی، نظم کا مرکزی خیال عورت اور مرد کے رشتے کی ازلی کہانی پر مبنی تھا۔جس کی ادراک کے ساتھ فلسفیانہ توضیح کی گئی تھی۔بس ایک ذرا طویل تھی۔ پینتیس سال پرانی بات ہے ٹھیک سے یاد نہیں۔ ہم نے حسب معمول کوئی جملہ پھینکا،جس میں ستائش کے ساتھ ساتھ اظہار کی بے باکی پر لطیف ساطنز بھی تھا۔ اجنبی لڑکی بدستور مسکراتی رہی۔ بعد میں اسٹیج پر جاکر جب شناسا شاعروں کی مزاج پُرسی کے بعد ساجدہ زیدی سے ہم علی گڑھ کے حوالے سے خود کو متعارف کرا رہے تھے،تو انہو ں نے آواز دے کر ایک لڑکی کو مخاطب کیا ’’سنو ادھر آؤ۔ان سے ملو یہ ہیں فیاض رفعت اور بھئی یہ ہماری بیٹی صبا زیدی ہیں۔ ٹیلی ویژن پروڈیوسر۔‘‘

لو بھئی ہم تو پانی پانی ہوگئے۔ یہ وہی لڑکی تھی جو ہماری برابر کی نشست پر بیٹھی ہوئی ہماری داد اور بیداد سے لطف اندوز ہورہی تھی۔کم کم ہی سہی ادبی محفلوں میں ساجدہ زیدی سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اُن سے پچھلی ملاقات ذاکرنگر میں واقع ان کے فلیٹ پر ۲۹ مارچ دو ہزار چار کو ہوئی تھی اور انہوں نے مغرب کے شاہکار ڈراموں پر مشتمل اپنی کتاب ’’چاروں موسم‘‘ ہمیں عنایت کی تھی۔ کتاب پر انہوں نے تحریر کیا تھا۔

’’آج کی شام کی یاد میں۔فیاض رفعت صاحب کے لئے خلوص و احترام کے ساتھ‘‘

ساجدہ زیدی

✪✪✪✪

۶۱۔۱۹۶۰ کا زمانہ تھا۔ ہم علی گڑھ یونیورسٹی میں بی۔اے کے طالب علم تھے۔

ہماری چھوٹی بہن مختار شاہینہ پاکستان گئی ہوئی تھیں۔ اُنہیں فکشن کے مطالعہ کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ پاکستان سے آئیں تو اُن کے ساتھ ڈھیر ساری کتابیں تھیں۔ انہوں نے خصوصی طور پر ہمیں قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' اور عبداللہ حسین کا ''اداس نسلیں'' دونوں ناول تحفتاً پیش کیے۔ وہ ہماری کمزوری سے واقف تھیں۔ تیرتھ رام فیروز پوری کے انگریزی ناولوں کے ترجمے ہم نے کھنگال ڈالے تھے۔ رئیس احمد جعفری کے تاریخی ناولوں سے بھی حظ اُٹھا چکے تھے۔ عبدالعلیم شرر کا ''منصور وموہنا'' بھی پڑھ چکے تھے۔ ہندی میں ''چندر کانتا'' کی ضخیم جلدیں مطالعہ میں آچکی تھیں۔ جو اصل میں ''طلسم ہوشربا'' سے متاثر ہوکر تخلیق کا موجب بنی تھیں۔ شاعری میں فیضؔ کا ''زنداں نامہ'' اور ''دست صبا'' ہماری پسندیدہ کتابیں تھیں۔ فکشن میں عظیم بیگ چغتائی کا ناول ''شریر بیوی'' ہم نے ہندی میں پڑھا۔ ہم جلد ساز کے یہاں اپنی کتابیں جلد سازی کے لئے لے کر گئے تھے کہ وہاں ہندی میں شریر بیوی پر نگاہ پڑی۔ پڑھنا شروع کیا تو اس قدر دلچسپ لگا کہ پورا ناول پڑھ کر اُٹھے۔

یونیورسٹی کی لٹن لائبریری میں بیٹھ کر ''میرے بھی صنم خانے'' اور ''سفینۂ غم دل'' پڑھ کر ہم قرۃ العین حیدر کی غیر معمولی نثر کے قائل ہو چکے تھے۔ ہم نے اُن کی طرز میں ایک افسانہ بھی لکھا۔ عنوان تھا عاشقی صبر طلب! یہ افسانہ بہت بعد میں ''آئینہ'' ممبئی میں اشاعت پذیر ہوا۔ جس کے مدیر ظ۔ انصاری تھے۔ یہ ''آئینہ'' کی اشاعت ثانی تھی۔ پہلے یہ مصور ہفت روزہ ادارہ شمع کی جانب سے دلّی سے شائع ہوتا تھا اور اس کے مدیر بھی ظ۔ انصاری تھے۔ جنہوں نے بعد میں روس جاکر روسی زبان سیکھی اور پشکن، چیخف اور دیگر روسی ادیبوں کو اُردو کے قالب میں پیش کیا۔ صاحب طرز ادیب تھے، صحافت میں بھی انہوں نے خوب نام کمایا۔ شاعری بھی کرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میدان میں اُن کی دال نہ گلی اور وہ شاعری سے تائب ہوگئے۔ قرۃ العین حیدر کے دلدادہ تھے اور ان کے تاریخی شعور کے عاشق! سچ تو یہ ہے کہ قرۃ العین کی تحریروں میں ایسی روانی اور ایسا فطری بہاؤ تھا، جو پتھر سے پھوٹنے والے چشمے میں ہوتا ہے۔

قرۃ العین حیدر سے ہماری پہلی ملاقات ممبئی کے مضافاتی علاقے سہار کی ایک پسماندہ کالونی میں ہوئی۔ ہم نئے نئے ممبئی میں وارد ہوئے تھے۔ بلٹز کے سابق اڈیٹر محمود ایوبی کی ایک کمرے کی کھولی اسی پسماندہ علاقے میں تھی۔ جہاں وہ اپنے دو معصوم بچوں اور نیک بی بی کے ساتھ اقامت پذیر تھے۔ انہوں نے عید الفطر کے دن ہمیں اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ ہمارے علاوہ قرۃ العین حیدر بھی اُن کی مہمان تھیں۔ بڑی خوشدلی سے ملیں۔ مگر ادب پر انہوں نے ایک جملہ بھی نہ بولا۔ بچوں کے ساتھ بیٹھی باتیں کر کے انہیں ہنساتی رہیں۔ وہ بچّوں کے لئے بھی تو لکھتی تھیں۔ ہمیں خیال پڑتا ہے ''کھلونا'' میں اُن کی کہانیاں چھپتی تھیں۔ اور ہاں انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بچوں کی کہانی ''بی چوہیا'' سے کیا تھا جو رسالہ پھول لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ کہانی کی اشاعت کے وقت ان کی عمر گیارہ سال تھی۔ ہمارے قارئین جانتے ہیں کہ اُن کے والد سجاد حیدر یلدرم علی گڑھ یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار تھے۔ افسانہ نگاری میں انہیں پریم چندر پر فوقیت حاصل تھی۔ رومانوی طرز تحریر کے وہ موجد تھے۔ احمد صدیق مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری تو بعد میں ''ادب لطیف'' کے خالقوں میں شامل ہوئے۔

قرۃ العین حیدر علی گڑھ میں پیدا ہوئی تھیں۔ ۱۹۲۷ء میں غالباً جنوری کے مہینے میں، اُن کی ابتدائی تعلیم بھی علی گڑھ میں ہوئی۔ ابھی ہم علی گڑھ کے حوالے سے زندگی ہے تو کہانی بھی ہوگی کی خامہ فرسائی میں ہمہ تن مصروف تھے کہ ریڈیو پر یہ جان گسل خبر سنی کہ اردو کی عظیم تخلیق کار اور بیسویں صدی کی عبقری شخصیت ۲۰ اگست ۲۰۰۷ء کی شب میں ہم سے رخصت ہوگئیں۔

عینی آپا علی گڑھ کی عاشق تھیں۔ جس کا اظہار اُن کے سوانحی ناول ''کار جہاں دراز ہے'' میں جگہ جگہ ہوتا ہے۔ ڈگی روڈ، میرس روڈ، تعلیم منزل، مسعود محل، پھوس کا بنگلہ، ویمنس کالج کو جانے والی شاہرہ، کالج کے بنیاد گزار شیخ عبداللہ، جو پاپا کے نام سے مشہور تھے، اُن کی بیٹیاں، بہوئیں اور بیٹے سبھی کے انہوں نے اتنے زندہ اور تابندہ خاکے کھینچے ہیں کہ جی خوش ہو جاتا ہے۔

غیر معمولی قوت اظہار کے اعتبار سے قرۃ العین حیدر اپنے ہم عصروں میں نکلتے ہوئے قد کی بڑی فسانہ گو تھیں۔ بائیس برس کی عمر میں ''میرے بھی صنم خانے'' (۱۹۴۹ء) اور پچیس برس کی عمر میں ''سفینۂ غم دل'' لکھ کر انہوں نے ادبی دنیا میں ہلچل مچادی تھی۔ ۳۲ برس کی عمر میں ''آگ کا دریا'' جیسا معرکہ خیز ناول لکھ کر انہوں نے فکشن کی تاریخ کو ایک نیا موڑ دینے کا امتیاز حاصل کیا۔

قرۃ العین حیدر ''اس کارِ جہاں دراز'' کی ایسی تماشائی تھیں جو تحریر کا طلسم جگاتے وقت کشف و کرامات کی انجانی البیلی اور غیر مرئی دنیا میں کھو جاتی تھیں اور اُن پر ایک عجب سانسکرات' کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ اُن کی زبان کی بے پناہ شیرینی اور اظہار کی سرمستی قاری کو ایسی بے کنار مسرت کے احساس سے دوچار کرتی ہے کہ وہ تزکیۂ نفس کے الوہی حسن سے سرشار ہو جاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر اشرافیہ طبقہ کی نمائندہ فسانہ گو تھیں۔ وہ داستان امیر حمزہ اور خصوصاً طلسم ہوشربا کے دفتروں سے گزر کر اپنے جادوئی زرنگار اسلوب کی حیرت خیز پرتیں کھولتی چلی جاتی ہیں۔ اُن کے کردار اشرافیہ طبقہ کے نمائندہ کردار ہوتے ہوئے بھی ہمیں اپنی شخصیت کی فطری تہہ داری اور عُمق کی قوّتِ ثقل سے اپنی جانب منعطف ہی نہیں کرتے وہ ہمارے وجدان کا غیر منقسم حصہ بھی بن جاتے ہیں۔

عینی آپا کی نگاہِ یگانہ شرر بار تاریخ پر ہی نہیں کروٹیں لیتے ہوئے وقت کی معاشرتی، عمرانی اور تہذیبی قدروں پر بھی تھی۔ جو ہر آن بدلتی رہتی ہیں۔ بے کنار وقت کا دریا ایسی کائنات ہے جہاں انسانی کشتی بلاخیز طوفان میں متلاطم ہے۔

اُن کا ناول ''آگ کا دریا'' ڈھائی ہزار سال کی عمرانی تاریخ کا اظہاریہ ہی نہیں انسانی زوال و عروج کی لامتناہی داستان کا بلیغ اشاریہ اور استعارہ بھی ہے۔ یہ کہنا تو نامناسب ہوگا کہ قرۃ العین حیدر کے بعد فکشن کی تاریخ ٹھہر گئی ہے لیکن یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ادب کی دُنیا میں ایک ایسا خلاء پیدا ہوا ہے جس کی بھرپائی دیر سے ہو سکے گی۔

وہ بیک وقت دربار، بازار اور خانقاہ جیسے اداروں کی مستحکم نمائندہ تھیں۔ آج وہ ملکۂ ایران فرح دیبا سے جدید فارسی میں محوِ گفتگو نظر آ رہی ہیں تو کل حضرت وارث علی شاہ کے آستانے پر عقیدت کے پھول نچھاور کرتی دکھائی دیں گی۔ اور پھر منظر بدلتے ہی کشمیر جیسے پرستان میں باغ سلیمان کے حوالے سے عظمت رفتہ کی دھواں دھواں کہانیاں بیان کرتی نظر آئیں گی۔

عینی زندگی کی بے ثباتی، انسان کی حرماں نصیبی، قدروں کی شکست و ریخت اور رشتوں کے ابتذال و انتشار کی صنعت کاری اور مصوّری کے لئے ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ جنہوں نے اُنہیں دیکھا، پڑھا اور محسوس کیا وہ بجا طور پر خود کو باعث افتخار و امتیاز جانیں گے۔ خوبیٔ قسمت سے اُن میں سے ایک ہم بھی ہیں۔

جن دنوں محمود بھائی علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے قرۃ العین حیدر وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے شعبۂ اردو کی زیب و زینت بڑھاتی رہیں۔

✪✪✪✪

زندگی اے زندگی

بیشتر پاکستانی جریدوں میں ہماری کہانیاں شائع ہونے لگی تھیں۔ ''ماہ نو'' میں چھپنے کے لئے ہم نے بہت زور مارا مگر مایوسی ہاتھ آئی۔ اُن دنوں ''ماہ نو'' کے اڈیٹر رفیق خاور تھے۔ جو باقاعدگی کے ساتھ اپنے نوٹ کے ساتھ ہماری کہانیاں واپس کرتے تھے۔ بیشتر کہانیوں پر اُن کا اعتراض یہ تھا کہ ہم اپنی کہانیوں کا تانا بانا غیر مسلم کرداروں کے گرد بُنتے ہیں اور اُنہیں بڑے طمطراق کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور یہ کہ اس طرح کی کہانیوں کی اشاعت ''ماہ نو'' جیسے سرکاری رسالے میں ممکن نہیں۔ اُن کی منطق سے ہم مطمئن تو نہیں ہوئے لیکن ہم نے ''ماہ نو'' کا مطالعہ جاری رکھا۔ اس کا معیار نہایت اعلا درجے کا تھا۔ خصوصی طور پر ابوالفضل صدیقی، ضمیرالدین احمد اور محمد عمر میمن کے افسانوں سے ہم بہت متاثر تھے۔ ضمیر علی گڑھ میں آل احمد سرور اور گورکھپور میں مجنوں گورکھپوری کے شاگرد رہ چکے تھے اور دونوں اساتذہ کے لئے اُن کے دل میں احترام و انصرام کا دریا موجزن رہتا تھا۔ نہایت ذہین اور فہیم شخص تھے۔ بعد میں وہ پاکستان منتقل ہو گئے۔ صحافی کا پیشہ اختیار کیا۔ مگر انہیں شہرت دوام اُن کے افسانوں کے امتیاز اور انفراد کی بناء پر ملی۔ جلد ہی وہ افسانہ نگاری سے بھی اُوب گئے اور لندن چلے گئے۔ غالباً اُن کی موت کے بعد اُن کے افسانوں کا مجموعہ ''سوکھے ساون'' کے نام سے شائع ہوا۔

✪✪✪✪

ہمارے سنجیدہ دوست اعجاز عسکری کہتے تھے۔ ''ہم آپ کی افسانہ نگاری کے تو قائل ہیں ہی لیکن ہم یہ سوچ کر بھی خوش ہو لیتے ہیں کہ آپ نے ادب کے ساتھ ساتھ دادا گیری کو فروغ دینے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ آپ قلم کے ساتھ ساتھ تلوار کے بھی دھنی ہیں''۔ ظاہر ہے ان کا مقصد لُطف و انبساط ہی تھا۔ مشہور ماہر

جغرافیات پروفیسر محمد شفیع کی طرح اعجاز عسکری بھی نئی زمینوں کے متلاشی تھے۔ انہیں اگر ہم ادب کا کولمبس کہیں تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر جے۔ این یو۔ چلے گئے تھے۔ پیشے کی مجبوریوں نے انہیں ادب سے اتنا دور کر دیا تھا کہ وہ اپنی شناخت کھو بیٹھے۔ اعجاز نے ہم پر ایک خاکہ بھی لکھا تھا یا ''خاکہ اڑایا تھا''۔ یہ سن ساٹھ کے آس پاس کی بات ہے، حنیف رامے کے ہفت روزہ نصرت لاہور میں اس کی اشاعت ہوئی تھی۔

امین اشرف ہمارے پرانے شناسا ہیں جب وہ انگریزی میں ایم۔اے کر رہے تھے، اُن سے ہلکی پھلکی ملاقاتیں رہتی تھیں۔ شاعری پہلے بھی کرتے تھے اب بھی کرتے ہیں۔ پہلے اُن کی ہنرمندی کے کم لوگ قائل تھے ادھر وظیفہ یاب ہونے کے بعد انہوں نے اپنی غزلیہ شاعری کا انتخاب ''جادۂ شب'' کے نام سے شائع کر دیا۔ فاروقی صاحب نے اپنے رسالے ''شب خون'' میں ان کی کلاسیکی مزاج کی غزلیں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیں۔ نہایت منکسر المزاج آدمی ہیں۔ ساٹھ سے اوپر نکل گئے، مگر آج بھی غزل سنانے کی فرمائش کی جائے تو عجز سے کام لیتے ہیں۔ انگریزی شعبہ میں لیکچرار کی اسامی کے لئے امیدوار تھے۔ انٹرویو دینے سے کترا رہے تھے بلکہ پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ غالب اور اقبال کے پرستار اور ہمارے دلّی یونیورسٹی کے اتالیق پروفیسر سروپ سنگھ اُردو والوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے بلکہ یوں کہا جائے کہ علی گڑھ والوں کے والہ وشیدا تھے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ انہوں نے پیغام بھجوایا کہ امین اشرف سے کہو ہمیں آ کر دو شعر سنا جائیں۔

عجز و انکسار کی تصویر بنے امین اشرف اجازت لے کر انٹرویو کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی محبت کے ساتھ اُن کی پذیرائی کی۔ اُن کے دو چار شعر سنے داد سے نوازا اور انہیں جانے کی اجازت مرحمت فرمادی اور یہ مژدہ جانفزا بھی سنایا ''میاں یہی تمہارا انٹرویو تھا''۔

لیجئے صاحب امین اشرف کا انتخاب ہو گیا تھا۔ علی گڑھ کے کچھ اور لڑکوں کو ڈاکٹر

صاحب دلّی یونیورسٹی لے گئے جن میں ہمارے عزیز دوست فرحت اللہ خان بھی شامل تھے۔ اور ہاں اقتدار صاحب بھی۔ یہ دونوں دلّی کالج میں انگریزی کے استاد رہے بعد میں علی گڑھ آ گئے ۔اقتدار صاحب شعبۂ لسانیات کے صدر ہوئے، فرحت اللہ خاں انگریزی کے صدر شعبہ اور پروفیسر رہے۔

فرحت کا ذکر ہوا تو دوست دار نیکوکار اور ادب و شاعری کے بے پناہ دلدادہ سیّد غلام سمنانی کا شاداب چہرہ یادوں کے چمن میں لہلہانے لگا۔ مرحوم دلّی کالج میں انگریزی کے استاد تھے۔ ہم سے بڑی خوشدلی اور خوش طبعی سے ملتے تھے۔ بات سے بات نکالتے تو یوں لگتا جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ اسلامی فلسفہ پر گہری نظر تھی فارسی کے کلاسیکی شعرا کا کلام حفظ تھا۔ حافظؔ، رومیؔ، خسروؔ، غالبؔ اور اقبالؔ اُن کے پیرو مرشد تھے۔ ہم سے بے بضاعتوں کے دل کی ٹھنڈک اور آنکھوں کی روشنی تھے۔ اکثر نثار احمد فاروقی کے ساتھ دیکھے جاتے جو خود بھی عربی اور فارسی میں درک رکھتے تھے۔ سمنانی صاحب کو ہمیشہ مولانا کہہ کر مخاطب کرتے۔ شام کو ٹہلتے ہوئے شاہجہانی مسجد کی طرف نکل جاتے جہاں استاد رسا کی خوش ادائیوں سے جی کو بہلاتے۔

حضرت امیر خسرو پر ان کی مختصر سی کتاب بہ زبان انگریزی نیشنل بک ٹرسٹ نے زیورِ طباعت سے آراستہ کی اُردو میں بھی دستیاب ہے۔ سرسید کے علی گڑھ کے تربیت یافتہ تھے۔ جانے والے کی یاد آتی ہے تو آئے چلی جاتی ہے ابھی اُن کے جانے کے دن نہ تھے۔

حضرت امیر خسرو نے اپنے مرشد شیخ نظام الدین اولیاء کو خضر اور مسیح کی خصوصیات کا حامل بتایا ہے۔ خضر کا کام انسان کو سیدھی راہ دکھانا اور معرفت الٰہی کی طرف اس کی رہنمائی کرنا ہے۔ شیخ علیہ السلام اپنے نفس گرم سے مُردوں کو جلا دیتے اور ان میں نئی روح پھونک دیتے تھے۔ خسرو نے اپنے شیخ کو ان دونوں کی مسند پر جلوہ افروز دیکھا۔ اقبال کی نظر بھی شیخ کی انہی دو خصوصیات پر گئی تھی:

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

ان نادر خیالات کا اظہار خلیق احمد نظامی نے اپنی مشہور تصنیف شیخ نظام الدین اولیاء کے مقدمہ میں کیا ہے۔ یہ ہمارے لئے باعث عز وشرف ہے کہ ہم نے اُن کی آنکھیں دیکھی ہیں اور ہمارے خاک بسر وجود میں اُس مٹی کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے جس نے اسلامی تصوف کے گہر شناس خلیق نظامی جیسے عالم بے بدل پیدا کئے ''تاریخ مشائخ چشت'' اس موضوع پر آپ کی معتبر تصنیف ہے۔ یہ ہمارے لئے شانِ افتخار ہے کہ ہم بھی اُن کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔

✪✪✪✪

اب ٹھیک سے یاد نہیں انٹر یا بی۔اے کا امتحان دے رہے تھے۔ ہندی کا پرچہ تھا۔اقبال بھائی بھی شریک تھے۔ہم گورنمنٹ ہائی اسکول میں سنسکرت پڑھ کر آئے تھے۔ ہندی میں طاق تھے۔ پیپر بھی آسان تھا۔ہم نے سبھی سوالوں کے جوابات ایک گھنٹے میں تحریر کر دیے۔اقبال بھائی ہمیں بدستور ٹکٹکا رہے تھے۔سرگوشیوں میں وہ ہمیں دھمکیاں بھی دیتے جا رہے تھے۔ ہندی کے حرف آشنا تھے،سوالات تو پڑھ لئے،اب جوابات کیسے دیں۔ خیر نظر بچا کر ہم نے اُن سے کاپی بدل لی۔اور ان کا پرچہ بھی حل کر دیا۔

نتیجہ آیا تو اُن کے نمبر ہم سے زیادہ تھے۔ بی۔اے کے بعد ہم نے یونیورسٹی کو الوداع کہا۔اقبال بھائی نے کسی طرح بی۔اے کر لیا۔ایتھلیٹ تھے،ممتحنوں کی چوکھٹ لے لی۔سائیکلیں دوڑا دیں،اتنی سفارشیں کرائیں کہ ممتحن حضرات کو نکّو کر ڈالا۔دینیات میں ایم۔اے ہوئے اور وہ بھی فرسٹ ڈویژن میں! کسی ضرورت مند مولانا کی حاجت روائی کر کے اُس سے پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ لکھوالیا۔ اس دوران ۱۹۶۵ء میں علی یاور جنگ سانحہ ہوگیا۔اُنکی جان بچانے میں بھیم سنگھ نے جان لڑادی،اُنہیں اس حادثے کے فوراً بعد اقدام قتل کے الزام میں جیل بھیج دیا گیا۔بصیر احمد خان اور باسط علی کے ساتھ مل کر وائس چانسلر کی داخلہ پالیسی کے خلاف مہم چلا رہے تھے مگر وہ تشدد کے خلاف تھے اور ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ وائس چانسلر کو گزند پہنچے۔کسی ناعاقبت اندیش نے پولس کو فون

کر کے بلالیا تھا،ایک لڑکے نے جوش میں آ کر سپرنٹنڈنٹ پولس شنگھلو کو دھکا دے
دیا،وہ گر پڑے ردِ عمل کے طور پر پولس نے لڑکوں کی بھیڑ پر گولی چلادی۔ دولڑکے شدید
طور پر مجروح ہو گئے،جنہیں مردہ سمجھ کر بھیڑ اپنے ہوش کھو بیٹھی اور اُس نے وائس چانسلر کو
زودکوب کیا۔ سرؔور صاحب کی انگلیوں میں بھی چوٹیں آئی تھیں۔ دروغ برگردن راوی
موقع غنیمت جان کر اقبال بھائی سلطانی گواہ بن گئے۔اور انعام کے طور پر انہیں
لیکچرر شپ عطا کردی گئی۔ ترقی کر کے وہ ریڈر ہو گئے۔ اور جس دن پروفیسر شپ کے
لئے انٹرویو تھا انہوں نے ایکسپرٹ کے لئے دیسی مرغوں کی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ دن
میں کسی وقت وہ شعبۂ دینیات سے باہر نکلے اور چہل قدمی کرتے ہوئے آرٹس فیکلٹی کی
طرف رواں دواں تھے اچانک موت کا فرشتہ بن کر دو موٹر سائکل سوار نمودار ہوئے اور
انہوں نے نہایت بے رحمی کے ساتھ اقبال بھائی کے جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ وہ
موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ زمین مافیاؤں کی جنگ میں ان کی جان چلی گئی۔ مرحوم ہم
سے مانوس تھے اور ہم مرحوم سے! خدا اُن کی مغفرت کرے۔ ہمارے لئے تو وہ اچھے
تھے۔

سول لائن کی ایک کشادہ مارکیٹ اُن کے نام سے نہیں اُن کے لقب سے منسوب
ہے۔ بُرولا مارکیٹ! انہیں اقبال بھائی کے نام سے کوئی یاد نہیں کرتا۔ برولا مارکیٹ سے
ہر کس و ناکس واقف ہے۔

✪✪✪✪

جذؔبی صاحب بیمار تھے۔ منظور ہاشؔمی کے ساتھ اُن کی عیادت کے لئے سرسید نگر
میں واقع ہم اُن کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ بڑے تپک سے ملے،عمدہ چائے پلائی،غم دوران
کی کم اور غم جاناں کی باتیں زیادہ کہیں۔ طبیعت رواں تھی خالص رُومانی اشعار سنائے
اپنی محبوباؤں کی یادیں تازہ کرتے رہے۔ منظورؔ نے اُن کی گفتگو ریکارڈ کر لی
تھی۔ ہمارے کرم فرما تھے۔ جب بھی شہر آتے ،گھر چلے آتے اور گھنٹوں باتیں کرتے
رہتے۔

جذبیؔ صاحب کی ایک زمانے میں سرورؔ صاحب سے گاڑھی چھنتی تھی۔ آگرہ سینٹ جانس کالج میں وہ اور مجاز ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ اُن دنوں جذبی صاحب ملالؔ تخلص کرتے تھے۔ فانیؔ اُن کے پسندیدہ شاعر تھے۔ حسرتؔ، اصغر اور جگر سے بھی مانوس تھے۔ میکش اکبرآبادی کی صحبتوں سے بھی فیض یاب ہوئے تھے۔ اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''فروزاں'' ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا۔ انگریزی اُردو اور فارسی کے اسکالر خواجہ منظور حسین اُن کے خصوصی استاد تھے۔ اُن کی اجازت اور مہر تصدیق کے بعد ہی انہوں نے ''فروزاں'' کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ بعد میں غالباً ۶۱۔۶۰ میں ''سخن مختصر'' کے نام سے اُن کا ایک اور مجموعہ انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا۔ اُن کی شعری کائنات مختصر تھی۔ مگر ان کے اشعار کی گرمی اور حلاوت آنے والی نسلوں کے ذہن و دل کو حرارت بخشتی رہے گی۔ وہ غزل کے بڑے شاعر تھے۔ اپنے اشعار میں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے:

اے موج بلا اُن کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفان کا نظارہ کرتے ہیں

یا پھر

جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جب وہ عمر کے آخری پڑاؤ پر تھے اُن پر اکرام و انعام کی خوب خوب بارش ہوئی۔ گراں گوشی کے ساتھ ساتھ آشوبِ چشم کے بھی شکار تھے۔ نحیف و نزار بھی ہو چلے تھے۔ انعام و اکرام کا کیا کرتے؟۔ سرور صاحب سے شکوہ سنج رہے۔ انہوں نے جذبی صاحب کو پروفیسر نہ بننے دیا۔ رہے نام اللہ کا! ادب کے بادہ خواروں سے انجمن خالی ہوتی جاتی ہے۔ موت سے کس کو رَستگاری ہے ایک دن سبھی کو جانا ہے۔

✪✪✪✪

ایک دن ہم ٹہلتے ہوئے ریزیڈینسی روڈ پر واقع کمال صاحب کے گھر پہنچے تو ڈرائنگ روم میں خلیل صاحب کو دیکھ ہمیں اچنبھے کے ساتھ بے حد خوشی بھی ہوئی ان کی

آنکھوں میں ذہانت کی جوت روشن تھی۔ چہرے پر ہلکی سی شفق رنگ سُرخی توانائی کا احساس جگارہی تھی۔خلیل صاحب کے ساتھ پرانے دنوں کی یادیں ارمانوں کا ہجوم لے کر جیسے اُمنڈ پڑیں۔

خلیل صاحب کو کینسر تھا۔ بلڈ کینسر! کشمیر کی خوش رنگ وادیوں میں وہ اپنے مرض کو بالکل بھول گئے تھے۔ تقریباً روز ہی اُن سے ملاقات رہتی۔ جب اُن کا جی چاہتا وہ ہمارے دفتر چلے آتے۔ اپنے کلام سے ہمیں فیض یاب کرتے۔ ہم نے اُن کی بہت ساری نظمیں، غزلیں ریڈیو کشمیر کے لئے ریکارڈ کیں جو اُن کے آخری مجموعۂ کلام ''زندگی اے زندگی'' میں شامل ہیں۔

یہ بھی اتفاق ہے کہ زندگی کے آخری دور میں اُن کا بیشتر وقت ہمارے ساتھ گزرا۔ جو یقینی طور پر ہمیں گمان کی سیڑھی پر لا کھڑا کرتا ہے اور پھر یہ ہمارے لئے وجۂ افتخار کیوں نہ ہو!

ہم علی گڑھ چھٹیوں میں گئے تو ارادے باندھ رہے تھے کہ یونیورسٹی کا چکر لگائیں گے تو خلیل منزل بھی ہو آئیں گے۔۔لیکن ہم نے جو سوچا تھا وہ پورا نہ ہو سکا۔خلیل صاحب اپنے جان لیوا مرض کے آگے سپر ڈال چکے تھے۔

اُن کے آخری سفر میں ہم بھی کاندھا دینے والوں میں شامل تھے۔ شہریار اور وحید اختر پر یہ سانحہ بجلی بن کر ٹوٹا تھا۔ زندگی کے کھیل نرالے ہیں۔ پس از مرگ اُنہیں پروفیسر شپ عطا ہوئی۔ آخر میں اُن کی نظم زندگی اے زندگی پیش خدمت ہے:

میں کہاں ہوں کچھ بتادے زندگی اے زندگی
پھر صدا اپنی سنادے زندگی اے زندگی
سو گئے ایک ایک کر کے خانۂ دل کے چراغ
ان چراغوں کو جگادے زندگی اے زندگی
وہ نشاطِ شعر و نغمہ، رت جگے وہ چہچہے
پھر وہی محفل سجادے زندگی اے زندگی

جس کے ہر قطرے سے رگ رگ میں مچلتا تھا لہو
پھر وہی اک شے پلا دے زندگی اے زندگی

اب تو یاد آتا نہیں کیسا تھا اپنا رنگ روپ
پھر میری صورت دکھا دے زندگی اے زندگی

اک مدّت ہو گئی روٹھا ہوں اپنے آپ سے
پھر مجھے مجھ سے ملا دے زندگی اے زندگی

جانے برگشتہ ہے کیوں مجھ سے زمانے کی ہوا
اپنے دامن کی ہوا دے زندگی اے زندگی

رچ گیا ہے، میری نس نس میں مری راتوں کا زہر
میرے سورج کو بُلا دے زندگی اے زندگی

✪✪✪✪

کہکشاں

علی گڑھ کے زمانے کے ہمارے پرانے ساتھی اشفاق محمد خاں قائم گنجی پٹھان ہیں۔ سینٹر آف انڈین لینگویجز جے۔این۔یو میں ایسوسیٹ پروفیسر تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سے لکھنؤ میں قیام ہے۔ جب بھی ہم فرصت میں ہوتے ہیں اُن سے ملنے چلے جاتے ہیں۔ خانصاحب کے عاشقوں میں ملک زادہ منظور احمد بھی ہیں۔اُن کے دیگر احباب میں مشہور افسانہ نگار بشیشر پردیپ، عابد سہیل سرفہرست ہیں۔ مرحوم گیان چند جین بھی اُن سے ہمیشہ محبت کا سلوک روا رکھتے تھے۔ رام لال اور محسن زیدی بھی انہیں بہت مانتے تھے۔ بڑے جگر والے آدمی ہیں۔ دل میں ٹھان لی تھی کہ پی۔ایچ۔ ڈی کر کے ہی دم لیں گے۔ چاہے دنیا ادھر سے اُدھر ہو جائے۔ آسمان گرتا ہے تو گرے، زمین شق ہوتی ہے تو ہو جائے۔ ارادہ باندھ لیا تھا تو اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیا۔اس راہ پر خار سے گزر تو گئے مگر علی گڑھ والوں نے انہیں لیکچرر شپ نہ دی۔ ادھر ادھر بھی ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے، کلرکی کر کے وقت کاٹا۔ دشت نوردی کی پرخار راہوں سے گزرے۔ سترہ خواجاؤں کی چوکھٹ دلی میں اُن کی مراد برآئی۔ خان صاحب کا جے۔این۔یو میں تقرر ہو گیا۔ اختراعی ذہن ہے۔ نصاب میں کشادگی لائے اردو کے طلباء کو Dramatics کے آداب سکھلائے، دیگر فنون لطیفہ سے روشناس کیا۔ آرٹ اور ادب کی بڑی شخصیات کو بلا کر لیکچرز کرائے، املا اور انشا کی باریکیاں سمجھائیں۔ رشید حسن خاں کو بھی زحمت دی کہ وہ محاورات اور مصطلحات کی خصوصیات کو روشن کریں! بس خدا کا کرنا، خان صاحب کی مقبولیت دن دونی رات چوگنی بڑھتی گئی۔ ہمارے ایک اور ساتھی صدرِ شعبہ تھے وہ میٹنگ لے رہے تھے، خان صاحب اور دیگر اساتذہ بھی موجود تھے کسی بات پر صدر شعبہ سے خاں صاحب نے اختلاف کیا۔ دونوں میں مکالمہ آرائی شروع

ہوگئی۔نوبت یا وہ گوئی تک آ گئی۔ خاں صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ! صدر شعبہ سے چیتے کی طرح چمٹ گئے اور وہ دھوبیا پاٹھ مارا کہ بے چارے چاروں شانے چت گرے۔ خاں صاحب نے موقع غنیمت جان اُن پر سواری گانٹھ لی۔ شعبے کے دیگر اساتذہ نے خوشامد درآمد کر کے صدرِ شعبہ کی جان بخشوائی۔ ورنہ بیچارے وہ تو مارے گئے تھے۔انہی دنوں خان صاحب نے ''مذہب مسلمان اور سیکولرازم'' پر ایک ضخیم کتاب مرتب کی تھی۔ نماز پڑھتے تو ہم نے انہیں کبھی دیکھا نہیں ''مسلمان'' ہونے کی زندہ اور تابندہ دلیل ہم پیش کر چکے ہیں۔ ہاں ہم اُن کے سیکولرازم پر ایمان ضرور لے آئے کہ اُن کے حلقۂ دوستاں میں غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کی تعداد زیادہ ہے۔

خان صاحب نے ''تفکرات'' کے نام سے بشیشر پردیپ، عابد سہیل اور مرحوم محسن زیدی کے فکر وفن پر اعلا درجے کی تاثراتی تنقید کی ہے۔

✪✪✪✪

خاں صاحب کے چھوٹے بھائی اشتیاق محمد خان بھی ہمارے بے تکلف بلکہ بے حجاب دوستوں میں شامل رہ چکے ہیں۔علی گڑھ یونیورسٹی کے بلائنڈ اسکول میں موسیقی کے استاد تھے۔''ترانۂ علی گڑھ'' کی خوبصورت دُھن آپ ہی نے ترتیب دی تھی۔ ذاکر صاحب اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر اشتیاق خاں نے مختصر ڈاکیومنٹری فلمیں بھی بنائیں۔ ممبئی منتقل ہو گئے تھے۔ جن دنوں وہ صابو صدیق ہوسٹل کے وارڈن تھے، گواجاتے ہوئے قرۃ العین حیدر ایک رات اُن کی مہمان رہی تھیں جس کا ذکر انہوں نے اپنے سوانحی ناول ''کارجہاں دراز'' میں کیا ہے۔صابو صدیق مسافر خانے کے حوالے سے وہ یوں رقم طراز ہیں۔

''یہ بھی بمبئی کی مسلم کلچر کے تانے بانے کا ایک حصّہ ہے۔ صابو صدیقی پولی ٹیکنیک، بہت سارے ہائی اسکول، مسافر خانے، کالج وغیرہ وغیرہ۔ صابو صدیق ہوسٹل کے وارڈن اشتیاق محمد خان تیسری منزل پر رہتے تھے۔اُن کی بیوی کنیز علی سردار جعفری تھیں۔ اشتیاق محمد خاں علی گڑھ یونیورسٹی کے مشہور گویّے تھے۔جن کے گائے ہوئے

ترانۂ علی گڑھ کے ریکارڈوں نے انہیں مزید شہرت بخشی تھی۔ کنیز گرلز اسکول میں ریاضی پڑھاتی تھیں''۔

آل انڈیا ریڈیو ممبئی کے لئے ہم نے اشتیاق خان سے کئی ڈرامے لکھوائے۔ اِن دنوں وہ یونین بینک آف انڈیا میں کام کرتے تھے جو چرچ گیٹ کے اطراف میں ہمارے دفتر کے نزدیک ہی تھا۔ آتے جاتے اُن سے ملاقات رہتی تھی۔ ہم سے محبت کرتے تھے۔ ہماری نازیبا باتوں کی بھی سنی ان سنی کردیتے تھے۔ بس اُن کا چہرہ اک ذرا سُرخ ہوجاتا تھا۔ ''شمع خانہ'' سے زیادہ ''بانوئے شہر'' کے قائل تھے۔ اساتذہ کے چوماچاٹی والے اشعار بڑی رغبت سے سناتے تھے۔ صوفی شاعر دردؔ کے کچھ سوقیانہ اشعار ہم نے نقل کرلئے تھے کہ وقت ضرورت کام آویں گے۔ منہ کا مزہ بدلنے کے لئے ایک دوشعر لکھے دیتے ہیں:

ہاتھا پائی سے ہانپتے جانا کھُلتے جاتے میں ڈھانپتے جانا
وہ ترا پیار سے لپٹ جانا اور دل کھول کے چمٹ جانا
وہ ترا منہ سے منھ بھڑا دینا وہ ترا جیب کا گڑا دینا

اشتیاق خاں صاحب کی یاد آتی ہے تو ہم ان کے پسندیدہ اشعار چھپ چھپا کر پڑھ لیتے ہیں کہ ان کی مغفرت کے لئے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ ہمیں نظر نہیں آتا۔

✪✪✪✪

یونیورسٹی میں ''ورک'' کرنے کی اصطلاح رائج تھی۔ ویمنز کالج کے آس پاس میں اکثر ٹیڈی بوائز نظر آتے تھے۔ اُن کا کام آہیں بھرنا اور حسن بے پرواہ کے دلسوز نظاروں سے دل کی لگی کو ہوا دینا تھا۔ مگر اس میں بھی شائستگی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اکثر نوخیز لڑکے یونیورسٹی سے ڈگی روڈ جانے والی شاہراہ پر لڑکیوں کے رکشوں کا تعاقب کرتے نظر آتے تھے۔ اکثر بے پردہ لڑکیوں کو شوخی و شرارت کا شکار بنایا جاتا تھا۔ ہلکے پھلکے ریمارکس بھی پاس کیے جاتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی دل جلا شعر کے پردے میں عشق خودبیں کو خود آرا کرنے کے لئے اظہار مدعا کردیتا تھا اور ٹھنڈی آہیں

بھرتا ہوا اُلٹا پھر آتا تھا۔

✪✪✪✪

اُن دنوں لڑکیوں کے کالج میں ایک محترمہ ہوا کرتی تھیں۔ ماشاء اللہ نہایت قد آور تھیں۔ امیر نشان، میرس روڈ اور پھوس والے بنگلے کے پاس اپنی عجوبہٗ روزگار سائیکل پر نظر آتی تھیں۔ یونیورسٹی کے رومان پرور عاشق مزاج لڑکے ان کی سائیکل دیکھتے ہی ہَوا ہو جاتے تھے۔ ان دخترِ نیک اختر کا نام تھا عالیہ! ورک کرنے والوں کی یہ محض سرزنش ہی پر اکتفا نہیں کرتی تھیں بلکہ ڈھول دھپّہ بھی ان سراپا ''ناز'' کا شیوہ تھا۔ یہ گاندھی گیری کے بجائے داداگیری میں یقین رکھتی تھیں۔ خدا انہیں سلامت رکھے انہوں نے اپنی پوری جوانی اصلاحِ عاشقاں میں گزار دی۔ گزشتہ دنوں ہم علی گڑھ گئے تو امیر نشان میں وہ نظر آگئیں۔ بالوں کی سیاہی سفیدی میں بدل چکی تھی مگر اُن کے دم خم وہی تھے۔ وہ اپنی نادر الوجود سائیکل سے دست کش نہیں ہوئی تھیں۔ ہوا کے تیز جھونکے کی طرح وہ ہمارے سامنے سے گزر گئیں اور ہمیں اتنی مہلت بھی نہ دی کہ اُن سے پوچھ لیتے۔ ''محترمہ آپ کے پرس میں میک اپ کے سامان کے ساتھ، دو انگل کا رامپوری چاقو ہوا کرتا تھا، کیا آپ اس روایت پر ہنوز قائم ہیں''۔

زہرہ ورما کالج میں پڑھاتی تھیں۔ وہ خود بھی حسین تھیں۔ اُن کی لڑکیوں کا کیا کہنا۔ تین بہنیں تھیں۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب، ہم ویمنز کالج کی دیوار سے لگی کوٹھی ''راحت کدہ'' میں رہتے تھے۔ عرفان خان بری یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اُن کے بڑے بھائی صفی خان نے ان کی لکھائی پڑھائی کی ذمہ داری ہم پر ڈال دی تھی۔ چالیس پینتالیس سال پرانی بات ہے۔ اب نہ چشم روشن ہے اور نہ دل شاد۔ ہاں ذہن کی چمک دمک ماند نہیں پڑی۔ غالباً سب سے بڑی پروین مراد کے ساتھ نصیرالدین شاہ کا معاشقہ شادی میں بدل گیا۔ اور وہ اُن کی زوجہٗ اول قرار پائیں۔ سب سے چھوٹی کے عاشق عرفان خان تھے۔ عرفان پڑھ لکھ کر آدمی بن گئے۔ داستانِ عشق کو ادھورا چھوڑ اپنے وطن قائم گنج سدھارے۔ کھیت کھلیان دیکھتے ہیں۔ آل اولاد والے ہیں، گاؤں بھر میں

پردھان جی کے نام سے مشہور ہیں۔ برسوں ہوئے انہیں دیکھا نہیں دل کے آئینہ خانہ میں اُن کی تصویر یجی رہتی ہے۔ ماضی کو لاکھ بھولو مگر یہ کمبخت یاد آئے چلا جاتا ہے۔

✪✪✪✪

یونیورسٹی کے دنوں میں ہمیں عشق لڑانے کی فرصت نصیب نہ ہوئی پڑھنے لکھنے کا شوق ہم سے بھوت کی طرح چمٹا ہوا تھا۔ نصابی کتابیں کم اور غیر نصابی کتابیں زیادہ اچھی لگتی تھیں۔ شام کو این۔آر۔ایس۔سی کلب ''بی'' میں بیڈمنٹن کے چیمپئن رشید بھائی کے ساتھ دو گھنٹہ بیڈمنٹن کھیلتے۔ اُنہیں ہم کبھی ہرا نہ پائے اُن کے علاوہ سعید محل والے سلطان بھائی کا ڈنکا بجتا تھا۔ ہمیں اُن کے ساتھ بھی کھیلنے کا شرف حاصل ہے۔ علی گڑھ والے تھے۔ چیف انجینئر ہو کر ریٹائر ہوئے۔ ہمارے نسبتی بھائی شکیل بعد میں اُن کے بہنوئی ہوئے۔ اُن کے وسیع مطالعہ والد سعید صاحب ہمیں بیحد پسند کرتے تھے۔ اکثر ہمارے افسانوں پر دل خوش کن تبصرہ فرماتے۔ ہماری طرح ابن صفی کی ''جاسوسی دنیا'' کے عاشق تھے۔ جو ہم باقاعدگی کے ساتھ ہر ماہ ان کی خدمت میں پیش کرتے۔ جاسوسی دنیا کا نیا ناول دیکھ کر وہ بچّوں کی طرح کِھل اُٹھتے۔ ہمیں پُرتکلف چائے پلاتے اور دعائیں دے کر رخصت کرتے۔ اگر ہم نے کوئی ترقی کی ہے تو اس میں ان کی دعائیں بھی شامل ہیں۔ معاذ اللہ! کیا خوب آدمی تھے۔

بھئی ہم اپنے پڑھنے والوں سے معذرت چاہتے ہیں ہم بھٹک جاتے ہیں! بھٹکاؤ تو ہمارے ضمیر و خمیر میں شامل ہے۔ یونیورسٹی کی حسین لڑکیوں کا ذکر ہو رہا تھا، جو ادھورا رہا جاتا ہے۔ روشن خیال اور روشن چہرہ معصومہ کاظمی انگریزی میں ایم۔اے کر رہی تھیں۔ سنہری فریم کے چشمہ میں ان کی شخصیت کا حسن بس دیکھتے ہیں بنتا تھا۔ وہ انگریزی میگزین کی ایڈیٹر تھیں۔ گورے چٹے عشرت عزیز بھی اُن کے ہم جماعت تھے جو بعد میں جا کر سفارت کار بنے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ وہ سعودی عربیہ میں ہندوستانی سفیر کے اعلا عہدے پر بھی فائز رہے تھے۔

اسے بدمعاشی کہیے یا شرارت! ایک دن ٹہلتے ہوئے ہم شعبۂ انگریزی کے

سمینار والے کمرے میں چلے گئے۔ تازہ تازہ انگریزی میگزین کی جلدیں میز پر نظر آئیں۔ ہمارے ساتھ منیر خان بھی تھے، انہوں نے پانچ سات شمارے اُٹھائے اور موقع غنیمت جان باہر نکل آئے۔ باہر آتے آتے وہ سنہری کمان کا چشمہ بھی اٹھالائے تھے جو وہیں کہیں اُنہیں نظر آ گیا تھا۔ اسے کہتے ہیں چوری اور اُس پر سینہ زوری! ہم نے منیر کو بُرا بھلا کہا مگر وہ بھلا نادم ہونے والے کہاں تھے۔ اُلٹا چمپانزی کی طرح ہم پر خوخیانے لگے۔ ہاں انہوں نے اتنا کرم ضرور کیا کہ وہ چشمہ ہمارے حوالے کر دیا۔

معصوم رضا راہی کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے ہمیں بڑے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا "میاں فیاض میگزین رکھ لو، چشمہ تمہارے کس کام کا وہ تو لیڈیز کے لئے ہے اُسے لوٹا دو۔" اور ہم نے مان لیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ معصومہ کاظمی اُسے خود لینے آئیں۔ وہ آئیں بھی، مگر اکیلی نہیں عشرت عزیز بھی اُن کے ساتھ تھے۔

معصومہ کاظمی مرانڈا کالج دلی میں لیکچرار ہو گئی تھیں۔ اُن کی شادی شعبۂ سیاسیات میں استاد کنور رفاقت علی خاں سے ہوئی جو بعد میں جامعہ چلے گئے تھے۔

✪✪✪✪

عابدہ رسول کشمیر کی تھیں۔ فزکس میں ایم۔ ایس۔ سی کر رہی تھیں۔ اُن کے حسن نظارہ سوز کی تعریف کے لئے ہم حرف و معنی کی کائنات کیسے سجائیں یہ عقدہ ہم سے حل نہیں ہوتا۔ جنت نظیر کشمیر میں ہم نے ساڑھے چھ برس گزارے۔ پھولوں کی اس وادیٔ پر کیف میں حسن بکھرا پڑا ہے۔ غیر فانی اور ابدی حسن اور عابدہ رسول تو حسن کی دیوی تھیں۔ ایک مقامی اخبار میں ہم ڈائری کے عنوان سے کالم لکھتے تھے جس میں محض اور محض عابدہ رسول کی درسی اور غیر درسی سرگرمیوں کی حکایت لذیذ تحریر ہوتی تھی۔ اُن کا سراپا قد و گیسو کی آرائش، رنگوں اور خوشبوؤں کا انتخاب، اُن کے عاشقوں کی آہ وزاری، اُن کے 'ملاقاتیو ں کی' دلداری، نکہت باد بہاری کی اٹھکھیلیاں، ان کی لگاوٹیں اور بیزاریاں لطف وانبساط کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر رنگ و نور کا جادو جگاتی تھیں۔۔ یونیورسٹی کے لڑکے اخبار کا بے صبری سے انتظار کرتے تھے جو ہاٹ کیک کی طرح بک

جاتا تھا۔

عاشقوں کی فصل وزدیدہ نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔ ایک سوڈانی لڑکے سے شادی خانہ آبادی کر کے انہوں نے سوڈان کے لئے رخت سفر باندھا۔لڑکے کا نام غالباً ہمدانی تھا۔ بعد میں وہ اپنے ملک کے سفارت کار کی حیثیت سے ہندوستان آیا۔ عابدہ رسول اب Mrs Ambassador بن چکی تھیں۔

✪✪✪✪

اسلوب احمد انصاری ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ ولیم بلیک پر اتھارٹی تھے۔شعبہ کے دیگر اساتذہ بھی اُن کا بیحد احترام کرتے تھے۔طلباء پر بھی ان کا رعب و دبدبہ قائم تھا۔ ہم انگریزی میں پھسڈی تھے، اُن کا منہ تکا کرتے اور حیرتی آئینہ بنے رہتے۔ شیکسپئر، مارلو، ہنرک ابسن چاسر اور ڈکنس کے نام پہلی بار ہم نے ان کی زبان مبارک سے سُنے۔اُن کے جوہر ہم پر کئی برس بعد کھلے جب ہمیں مطالعے کا شوق جنون کی حد تک ہوا۔ اقبال اور غالب پر ان کی مختلف تحریریں پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ سال مں دوبار وہ ششماہی ''نقدونظر'' شائع کرتے ہیں۔ غالب نمبر میں اُنکا مضمون ''جستجوئے حقیقت'' پڑھ کر ہماری طبیعت خوش ہوگئی۔ ''بادبان'' شمارہ نمبرا کراچی میں سرور صاحب کی خودنوشت پر ان کا بے لاگ اور بے باک تبصرہ پڑھ کر ہم اُن کے بسیط مطالعے اور عمیق نگاہ پر ایمان لے آئے۔ شمارہ نمبر دو میں مشتاق احمد یوسفی کی ''آب گم'' پر اُن کا عالمانہ تبصرہ پڑھ کر ہی یہ سمجھ میں آیا کہ Irony, Wit اور Satire میں کیا فرق ہوتا ہے۔ کہیں اُن کا مضمون ''بجنوری اور نقد غالب'' بھی پڑھا تھا۔بجنوری نے دیوان غالب کو مبالغہ کی حد تک ایک مقدس کتاب کے مساوی قرار دیا ہے اس متھ کو اسلوب صاحب نے بہ طرز احسن توڑا ہے۔ غالب اور اقبال کے علاوہ انہوں نے رشید صاحب کے فن اور شخصیت پر بھی گرانمایہ کام کیا ہے۔

ہمارے چھوٹے بھائی اشفاق محمد خاں بھی اُن کے شاگرد رہے ہیں۔وہ چار برس تک اسلوب صاحب سے فیض یاب ہوتے رہے۔جب وہ انگریزی آنرز کے آخری

سال میں تھے تو انگلش میگزین کے اڈیٹر کے لئے اسلوب صاحب کی نگاہ انتخاب اُن پر پڑی۔ آجکل اشفاق انگریزی نیوز ایجنسی پی۔ ٹی۔ آئی کے سربراہ ہیں۔ شہریار نے بھی اُنہیں پڑھایا۔

اسلوب صاحب کے علاوہ شعبہ انگریزی میں سلامت اللہ خاں صاحب بھی تھے۔ جنہیں دیکھ کر ہمیں ہالی وڈ کا ہیرو گریگوری پیک یاد آتا تھا۔ دراز قدر، ستواں ناک، مضبوط دہانہ، چوڑی پیشانی، غزالی آنکھیں اور ایک عجب سا تجاہل عافرانہ۔ بیحد شگفتہ ذہن تھے۔ بات کرتے تو لگتا جیسے پھول جھڑ رہے ہوں۔ انگریزی کی رومانی شاعری مزے لے لے کر پڑھاتے تھے۔ ڈوائن کامیڈی اور پیراڈائز لوسٹ جیسے کلاسکس کا ابتدائی تعارف آپ ہی نے کرایا۔ میر تقی میر پر ہم نے اُن کا مضمون قمر رئیس کی ایڈٹ کی ہوئی اردو میگزین میں پڑھا تھا۔ اور اُن کے مضمون سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ہم نے بھی میر کی شاعری پر مضمون لکھ ڈالا۔ اُن کے مضمون سے کچھ زیادہ ہی استفادہ کیا تھا، کسی رسالے میں اشاعت کے لیے بھیجا فوراً چھپ گیا۔ غالباً چنڈی گڑھ کے پاسبان میں شائع ہوا تھا۔ عمر نے وفا نہ کی اور بلڈ کینسر کے موذی مرض نے اُن کی جان لے لی۔ خدا انہیں اعلا درجات عطا کرے۔ کیا عمدہ شخص تھے۔

✪✪✪✪

حفیظ صاحب شعبۂ قانون میں پروفیسر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ روائتی شریفانہ لباس پہنتے تھے۔ شیروانی کے ساتھ گول ٹوپی ضرور ہوتی تھے۔ میرس روڈ پر کوٹھی تھی، مجلسی آدمی تھے۔ لوگوں کا اژدھام انہیں گھیرے رہتا تھا۔ شہر کے لوگوں میں بھی وہ توقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ یوں تو انہوں نے اپنے بے شمار شاگردوں کو جج، مجسٹریٹ اور منصف کے اعلا درجات تک پہنچتے ہوئے دیکھا، لیکن وہ خصوصی طور پر پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھنے والے اعلا قانون کے طالب علم بودھ پریہ موریہ سے نسبت خاص رکھتے تھے او ریہ انہی کی شفقت اور تربیت کا نتیجہ تھا کہ بی۔ پی۔ موریہ ۱۹۶۲ء میں علی گڑھ سے لوک سبھا کی سیٹ جیت گئے۔ موریہ صاحب نہایت صاف ذہن کے آدمی تھے۔ فراخدلی کا یہ

عالم تھا کہ دلی میں اُن کی رہائش گاہ پانچ جن پتھ روڈ کے دروازے علی گڑھ والوں کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ حفیظ صاحب کا یہ ہونہار شاگرد ۱۹۷۱ء میں مرکزی کابینہ میں وزیرِ صنعت اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جنرل سیکریٹری بھی رہا۔ راقم سے بھی اُن کی یاد اللہ تھی۔ ہم نے، جب پہلی بار اُن کے دولت کدہ پر حاضری دی تو وہ ہم سے نہایت جوش وخروش کے ساتھ ملے۔ گلے لگایا اور بڑی پُر تکلف ضیافت کی۔ اور اپنی بیوی سے یہ کہہ کر ہمارا تعارف کرایا'' کانتا! فیاض صاحب ہمارے چھوٹے بھائی ہیں، علی گڑھ کے الیکشن میں ہمیں جتانے کے لئے انہوں نے جان لڑا دی تھی''۔ پھر انہوں نے ہمارا حال احوال پوچھا۔ ہم نے انہیں بتلایا کہ فرسٹ ڈویژن میں ایم۔اے کیا لیکن ابھی تک کوئی باقاعدہ نوکری ہاتھ نہیں لگی۔ یہ سنتے ہی انہوں نے اپنے پی۔اے کو آواز دی اور اُس وقت کے ریلوے وزیر للت نرائن مشرا کے نام خط املا کرادیا کہ ہمارے لئے ریلوے میں کوئی کلاس ون پوسٹ مخصوص کی جائے۔ جس کے لئے موصوف نے ہمیں ہر طرح سے مستحق قرار دیا تھا۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں! مسلمانوں کے دلی ہمدرد تھے چھاگلہ کے زمانے میں یونیورسٹی ایکٹ میں جو تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ اُس کے سخت مخالف تھے۔ مرتے دم تک یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کے لئے عملی جدوجہد کرتے رہے۔

اندرا گاندھی کانگریس کی قیادت کررہی تھیں۔ اقلیتی کردار کی بحالی کے مسئلہ پر انہوں نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ حالانکہ سیاسی بساط پر اُن کے مہرے پٹتے چلے جارہے تھے۔ ہائی کورٹ کے جسٹس سنہا نے اُنہیں نااہل قرار دیتے ہوئے سیاست سے چھ برس تک دور رہنے کا حکم نافذ کردیا۔ مسز گاندھی ضدی خاتون تھیں۔ سیاست کی بازی کو پلٹتے دیکھ کر انہوں نے ۲۴ جون ۱۹۷۵ء کو ایمرجنسی کا اعلان کردیا۔ جسے ہندوستانی عوام نے جمہوریت پر ایک زبردست حملہ قرار دیتے ہوئے ۱۹۷۷ء کے لوک سبھا کے انتخابات میں مسترد کردیا۔ کانگریس کی اس شکست فاش میں مسلمانوں کا بھی ہاتھ تھا۔ جنتا حکومت مرارجی دیسائی کی ناقص قیادت کی بنا پر جلد ہی زوال پزیر ہوگئی۔ مسلمانوں کو اپنے ساتھ لانے کے لئے مسز گاندھی کی کانگریس نے اعلان کیا کہ اگر وہ برسر اقتدار

آئیں تو یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بحال کر دیا جائے گا۔ ۱۹۸۰ء کے لوک سبھا کے وسط مدتی انتخابات میں کانگریس نے جیت درج کی اور ۱۹۸۱ء میں اقلیتی کردار کی بحالی کے لئے قانون نافذ کر دیا گیا۔ اور بھولے بھالے مسلمان خوش ہو گئے۔

✪✪✪✪

احمد جمال پاشا سے ہماری ملاقات قمر رئیس کے بدر باغ والے کمرے میں ہوئی تھی۔ ہنستے مسکراتے لہلہاتے باغ و بہار شخصیت والے اس شخص سے مل کر ہمیں واقعی مزہ آیا۔ رسمیات اور تکلفات سے کوسوں دور تھے، قمر رئیس کو اماں قمر، اماں قمر کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ ''مجاز کے لطیفے'' اُن کی مرتب کردہ کتاب جھلک رسالے کے اڈیٹر طاہر قریشی نے شائع کی تھی۔ از راہ محبت انہوں نے ایک نسخہ ہمیں بھی عنایت کیا۔ ہم مشکور ہونے کے ساتھ ساتھ محظوظ بھی ہوئے۔ پاشا ایس۔ ایس۔ ہال میں رہتے تھے۔ اُردو میں ایم۔ اے کر رہے تھے۔ ''ادب میں مارشل لا'' لکھ کر جمال مزاح نگاروں کی اگلی صف میں بلکہ ہراول دستے میں شامل ہو چکے تھے۔ ہر طرف سے ان پر تعریفوں کے ڈونگرے برس رہے تھے، مزاح لکھنے کی طرف اُنہیں عابد سہیل نے راغب کیا تھا۔ اور شائد اُن کے ابتدائی مضامین میں جہاں تہاں قلم بھی لگایا تھا۔

ادب کے تعلق سے کوئی خاص بات ہمارے ذہن میں آتی تو ہم سیدھے احمد جمال پاشا کے کمرے کا رُخ کرتے اور اپنی خاص بات ان کی خدمت میں پیش کرتے جسے وہ ''گھاس'' بات کہہ کر قہقہوں میں اڑا دیتے۔ شفیق الرحمٰن کی حماقتیں، مزید حماقتیں ہمارے ذہن میں گھوم جاتیں۔ پاشا بھی اُسی کلّے ٹھلّے کے مزاح نگار تھے ان کے یہاں طنز زیریں کی لہریں جا بجا اٹھکھیلیاں کرتی نظر آتی تھیں۔ وہ نہایت لطیف طنزیاتی ادب کے خوگر و شائق تھے۔ اُن کے مزاح کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اتنا ہنساتے تھے کہ ہنستے ہنستے آنکھ سے آنسو نکل پڑیں اور یہی اُن کا کمالِ فن تھا۔ لکھنو والے تھے زبان سے کھیلنے کا فن جانتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں سے ایسی فضا پیدا کرتے کہ لطف و انبساط کی گھڑیاں دوچند ہو جاتیں۔ ''دشکَر کا چکر''، ''ستم ایجاد کرکٹ اور میں بے چارہ''، ''غدر

۱۹۵۷ء کے اسباب'' ''کتّے کا خط پطرس کے نام'' ایسے ہی بے پناہ مضامین ہیں جو اُن کی عبقریت کا پتہ دیتے ہیں۔ علیم صاحب پر اُن کا خاکہ بھی پڑھنے کی چیز ہے۔

ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''.....پھر ایسا ہوا کہ علیم صاحب شعبۂ عربی کے صدر ہو کر علی گڑھ چلے گئے۔ جہاں اسلامک اسٹڈیز کے ڈائریکٹر ہوئے۔ حصولِ علوم کا شوق مجھے بھی علی گڑھ لے گیا۔ سرسیّد ہال کے سامنے شمشاد مارکیٹ جانے والی سڑک پر روزانہ شام کو دیکھتے کہ علیم صاحب پروفیسر نورالحسن کے یہاں بدرباغ چلے جارہے ہیں۔ کبھی بیچ راستے میں دونوں دوست ایک مسکراہٹ کے ساتھ مل جاتے اور کسی کے یہاں روانہ ہوجاتے۔ اکثر اُن میں سے ایک اس طرح گھوم جاتا کہ دوسرے کی پیش قدمی میں فرق نہ آتا۔ اُن کو آتا دیکھ کر ہم لوگ گھڑیاں ملالیتے۔ کبھی کبھی رات کو دیکھتے کہ پروفیسر نورالحسن، پروفیسر علیم کو سہارا دے کر گھر پہنچانے جارہے ہیں اور کبھی پروفیسر علیم اُنہیں سنبھالے گھر چھوڑنے جارہے ہیں....''

احمد جمال پاشا نے کم عمری میں دنیا سے رخصت لی۔ مگر وہ جب تک جیے، زندگی کی کڑواہٹوں کو قند ہلاہل بنا کر پیش کرتے رہے۔ یادِ یارِ مہربان ہمارے لئے وہ متاعِ عزیز ہے جسے ہم نے آج بھی اپنے دل میں بسا رکھا ہے۔

اختتامیہ کے طور پر اُن کے انشایئے ''مونچھیں'' سے ایک اقتباس پر نظر ڈالتے چلیں۔

''مردانہ حسن میں مونچھوں کی وہی اہمیت ہے جو محبوب ستم پیشہ کے لئے زلف بنگالہ کی.....اور ایسی مونچھیں تو بالکل نہیں پسند کی جاتیں جن کا زیادہ تر قیام وطعام منہ کے اندر رہتا ہے''۔

✪✪✪✪

مکھن والے باؤجی کا ہم کہیں پہلے بھی ذکر کرچکے ہیں۔ ہمارے لڑکپن کے دن تھے۔ اُن کی وسیع وعریض بلڈنگ کے نزدیک ہی ہمارا گھر تھا۔ بلڈنگ کے نچلے حصّے میں

مکھن بنانے کی فیکٹری تھی۔ اوپری منزل میں اُن کی رہائش تھی۔ مکھن کی کشش وقت ناوقت ہمیں ان کے گھر لے جاتی تھی۔ اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ بلقیس، حفیظ، نسیم اور شمیم چار بیٹیاں تھیں۔ چاروں ہم سے اور ہم اُن سے مانوس تھے۔ جوان ہوتی ہوئی بلقیس اور حفیظ غضب ناک حد تک خوبصورت تھیں۔ دونوں بہنیں ہمیں پکڑ کر بیٹھ جاتیں اور ہمارے پھولے پھولے گالوں پر چٹاخ پٹاخ بوسے ثبت کرتیں۔ کبھی کبھی جوش میں آتیں تو ہمارے گالوں کو پہلے چاٹتیں پھر کاٹ لیتیں اور ہم سی۔سی کرتے رہ جاتے۔ یہ عمل وہ تقریباً روز دہراتی تھیں اور ہم لذت آزار کی خاطر ان کے یہاں جانا نہ بھولتے۔

نسیم ہماری ہم عمر تھی۔ وہ ہمیں کمرے میں لے جا کر ہمارے ساتھ گڑیوں گڈّے کا کھیل کھیلتی، گڑیا گڈے کی شادی کی رسم کی ادائیگی کے بعد دلہن کی رخصتی ہوتی اور دولہا دلہن کو اپنی مسہری پر لٹا کر کہتی ''فیاض آؤ دولہا دولہن کا کھیل کھیلیں''۔

نسیم نے پولٹیکل سائنس میں ایم۔اے کیا تھا۔اس نے شادی نہیں کی تھی۔بس اکیلی تنہا اپنے کمرے میں قید رہتی۔لوگوں سے ملنا جلنا اس نے تقریباً ترک کر دیا تھا کسی نفسیاتی بیماری نے اس کے ذہن و دل پر گہرا اثر ڈالا تھا۔آوازوں سے اُسے ڈر لگتا تھا۔اُس کی بیماری کی تشخیص بھی نہ ہو سکی۔

ایک زمانے بعد ہم علی گڑھ گئے تو یہ سُن کر ہم پر بجلی سی گر پڑی کہ نسیم زمان و مکان کے سلاسل سے آزاد ہو چکی ہے۔ ہماری لڑکپن کی محبت شمعِ خاموشی میں تبدیل ہو چکی تھی۔

✪✪✪✪

ڈاکٹر نسیم انصاری فرنگی تہذیب کے پروردہ نامور سرجن علی گڑھ والوں کی اصطلاح میں آل راؤنڈر تھے۔ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ زمانہ طالب علمی میں بہترین مقرر رہے۔اُن کے قریبی ساتھیوں میں مونس رضا کا نام سرفہرست آتا ہے جو کچھ دنوں تک جنرل ایجوکیشن میں لیکچرر رہے۔ بعد میں جا کر جے۔این۔یو اور دلّی یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی۔

ڈاکٹر نسیم انصاری کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ ترقی پسند ادب کے بھی بہترین نبّاض تھے۔اردو میں دوسری جنگ عظیم کے بعد جو نیا ادب جنم لے ہا تھا اُس کے لکھنے والوں میں نسیم انصاری کے چچا حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، بیدی، کرشن اور احمد ندیم قاسمی پیش پیش تھے۔عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو نے افسانے میں ایک نئی راہ نکال۔ یہاں یہ بھی عرض کرتے چلیں کہ سعادت حسن منٹو علی گڑھ آئے تھے اور انہوں نے یونیورسٹی میں داخلہ بھی لیا تھا۔ایس۔ایس ہال ایسٹ کے کسی کمرے میں رہتے تھے۔ اُن کے معنوی اُستاد باری علیگ تھے۔ جنہوں نے منٹو کو ترجمہ کے آداب سکھلائے۔ منٹو کچھ مہینے یونیورسٹی ہاسٹل میں رہ کر واپس چلے گئے۔ انہیں ٹی۔ بی ہوگئی تھی۔وہ امرتسر ہوتے ہوئے کشمیر کے صحت افزا مقام بٹوت چلے گئے۔منٹو کا ذکر ضمناً آ گیا لیکن یہ از بس ضروری تھا۔

نسیم انصاری کو گھڑسواری کا شوق تھا وہ رائڈنگ کلب کے ممبر تھے۔گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر کھڑے ہوکر اُسے سرپٹ دوڑاتے تھے۔کلکتہ سے ڈاکٹری پڑھ کر علی گڈھ میڈیکل کالج میں لیکچرر ہوئے،مگر گھوڑسواری کے شوق سے دامن نہ چھوٹا۔اسی دوان ان کا گھوڑا پھسل گیا،ڈاکٹر انصاری کے ہاتھ اکھڑ گئے۔ کسی مریض کا آپریشن ہونا تھا۔اسے پتہ چلا کہ جو ڈاکٹر اس کا آپریشن کرنے جارہے تھے وہ گھوڑے سے گر کر اپنے ہاتھ تڑوا بیٹھے ہیں۔اس نے اس حادثہ کو بدشگونی سے تعبیر کیا اور ہسپتال چھوڑ کر بھاگ لیا۔نسیم انصاری کے ساتھی ڈاکٹر عباس خان نے اُن کے دونوں ہاتھوں کی ہڈّیوں کو صحیح جگہ پر بٹھادیا اور جلد ہی وہ روبہ صحت ہوگئے۔انہوں نے اپنی مفرور مریضہ کو تلاش کیا اور اپنے دلائل سے مطمئن کر کے آپریشن کے لئے آمادہ کرلیا۔آپریشن کامیاب رہا۔

پولو کا گیم علی گڑھ میں شروع کرانے کا سہرا بھی ڈاکٹر نسیم انصاری کے سرجاتا ہے۔مرحوم نیزے بازی کے فن میں بھی طاق تھے۔اُن کی چھوٹی بیٹی زویا بھی یونیورسٹی کی بہترین شہہ سوار رہ چکی ہے اور نیزے بازی کے مقابلے میں انعام حاصل کرچکی ہے۔شناسائی تو اُن سے علی گڑھ کے زمانے سے تھی۔ یہ قربت میں اس وقت

بدلی جب ہم نے اُن کی کتاب ''جواب دوست'' پڑھی۔ جوانہوں نے پرانے علیگیر ین مختار مسعود کی کتاب ''آواز دوست'' کے جواب میں لکھی تھی۔ جو ۱۹۴۸ء میں نقل مکانی کرکے پاکستان چلے گئے تھے۔اگر آپ دونوں ملکوں کی عبرت انگیز روئیداد تفصیل سے جاننا چاہتے ہیں تو یہ دونوں کتابیں ضرور پڑھیے۔

ریٹائر ہوکر لکھنؤ آئے تو دانش محل میں مل گئے۔ کتابوں کی دوکان کے مالک نسیم صاحب سے باتیں کررہے تھے۔ ہلکی ہلکی سردی کا زمانہ تھا۔نہایت قیمتی سوٹ زیب تن تھا۔ ہم نے پرانی یادوں کوزندہ کرنے کے لیے اپنا تعارف کرایااور دانش محل سے اپنی افسانوں کی کتاب ''میرے حصّے کا زہر''خرید کرنہایت ادب کے ساتھ انہیں پیش کردی۔اتفاقی طور سے دوسری ملاقات نیّر مسعود کے دولتکدہ پر ہوئی۔ بہت دیر تک لکھنو کی تہذیب پر بڑے رسان اور شگفتگی کے ساتھ گفتگو کرتے رہے۔ لال باغ میں مطب بھی کرتے تھے۔ یہاں بھی فیض کا دریا جاری رہا۔ اچھے آدمی تھے۔علی گڑھ میں جب ریڈر تھے تو اُن کی شہرتِ دوام سے ناخوش ہوکر کچھ لوگوں نے طلباء کے ایک حلقہ کو اس پر آمادہ کرلیا گیا کہ وہ میڈیکل کالج کے انتظام کے خلاف تحریک شروع کردیں۔اس سازش میں میڈیکل کالج کے اُن کے ساتھی اساتذہ بھی پیش پیش تھے۔

طلباء کی یونین کے کچھ لیڈروں سے اُن کا سامنا ہوگیا۔ اتفاق سے اُن میں سے کسی نے یہ کہہ دیا کہ آپ کے اوپر اتنی ذمہ داریاں ہیں کہ شائد ان سے آپ کی کارکردگی میں فرق آجائے۔ اُنہیں یہ بات بہت ناگوار گزری۔ردِ عمل کے طور پر انہوں نے چیف میڈیکل آفیسر میڈیکل کالج ہسپتال کی ذمہ داری، رائڈنگ کلب کی صدارت اور رسالہ ''فکرونظر'' کی مجلس ادارت سے استعفیٰ لکھ کر لڑکوں کے حوالے کردیا کہ اسے لے جاکر وائس چانسلر کی خدمت میں پیش کردیں۔

وائس چانسلر علی محمد خسرو کی اعلاظرفی نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا اور جلد ہی انہیں ریڈر کے عہدے سے ترقی دے کر پروفیسر بنادیا۔ یونیورسٹی کی تاریخ میں شاذونادر ہی کبھی ایسا ہوا ہے کہ وائس چانسلر نے اپنے خصوصی اختیارات سے کسی استاد کو

پروفیسر بنادیا ہو۔ اب خسرو صاحب ہیں اور نہ نسیم انصاری! بس اُن کی یادوں کی خوشبو باقی ہے۔

✪✪✪✪

علی گڑھ یونیورسٹی میں پہلی بار انٹرورسٹی ویمنز ہاکی ٹورنامنٹ ہونے جارہا تھا۔ پنجاب اور دیگر ریاستوں کی لڑکیاں اسپورٹ شرٹ اور پینٹ میں تھیں۔ ہاکی گراؤنڈ یونیورسٹی کے پانچ ہزار لڑکوں سے بھرا ہوا تھا۔ خلاف توقع بمبئ کی لڑکیاں نیکر پہن کر میدان میں اُتریں تو لڑکوں کی باچھیں کھل گئیں۔ ایسا تماشا تو انہوں نے محض سرکس میں دیکھا ہوگا۔ بمبئ کی ٹیم نسبتاً کمزور تھی۔ پنجاب کی لڑکیاں کھیل پر حاوی نظر آرہی تھیں مگر لڑکے تھے کہ بمبئ کی لڑکیوں کا حوصلہ سیٹیاں بجاکر بڑھا رہے تھے۔ اُنکا جوش وخروش بس دیکھتے ہی بنتا تھا۔ جب تک یہ ٹورنامنٹ چلتا رہا مسجد کے نمازی لڑکے بھی ہاکی کے میدان میں ماشاء اللہ بہت خوب، بھئی کیا Move بنایا ہے، واے کمال کرتی ہو، کیا بجلی کی طرح چمک کر بال پکڑی ہے، بھئی سبحان اللہ! ہمارے لڑکوں کو بھی کوچ کردیجئے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے سنے گئے۔ کوایجوکیشن ہوتی تو کیا مزے کی مشترکہ ٹیم بنتی'' وغیرہ وغیرہ۔

اب ہاکی کا ذکر ہوا تو ہم بتاتے چلیں کہ ہماری یونیورسٹی نے انعام الرحمٰن، علی سعید، ظفر اقبال جیسے انٹرنیشنل کھلاڑی پیدا کیے۔ انعام تو دنیا کے مانے ہوئے لیفٹ اِن تھے۔ سولو کھیل کھیلتے تھے اور گول داغ کرہی میدان سے پلٹتے تھے۔ پری یونیورسٹی میں تھے اور غضب ڈھاتے تھے۔ ۱۹۶۴ء کا اولمپک ہمارے کلاس فیلو علی سعید نے کھیلا اور ملک کے لئے میڈل جیت کر لائے۔ انعام کو ۱۹۶۸ء میں اولمپک کھیلنے کا موقع ملا حالانکہ وہ اس کے حقدار ۱۹۶۴ء میں بھی تھے۔ غصہ ان کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ میدان میں بھی بھڑک جاتے تھے کچھ بھی ہو ہاکی کیا کھیلتے تھے جادو کرتے تھے۔ ایک بار اسٹک پر بال آتی تو Dodge دیتے ہوئے پلک جھپکتے گول تک پہنچ جاتے۔ علی سعید بھی اپنے فن میں یکتا تھے۔ ان لوگوں کے علاوہ سبھاش، گوبندا، کوشک، اقبال محمد خان، سلطان اور حسیب

نے بھی انڈیا کو Represent کیا۔ علی گڑھ کے علاوہ پنجاب اور بھوپال بھی ہا کی کی نرسری تھے۔ کرکٹ میں لالہ امرناتھ، اور مشتاق احمد نے پوری دنیا میں یونیورسٹی کا نام روشن کیا۔ ہمارے تعلیمی دور میں احسان رشید اور محمد شاہد بہت اچھی کرکٹ کھیلتے تھے۔ شاہد نے یو۔ پی رانجی ٹرافی میں برسوں اپنے جوہر دکھائے۔ رسل گنج میں رہتے تھے اور کلب میں اُن سے تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔ مشہور شاعر حسن نعیم بھی علی گڑھ کے تربیت یافتہ تھے بہت اچھی بیڈمنٹن کھیلتے تھے بعد میں جا کر انہوں نے غزلیہ شاعری کو جدید لب و لہجہ عطا کیا۔ اچھے کھانوں کے بھی شوقین تھے۔ دم پُخت خوب بناتے تھے اور دوستوں کو کھلا کے خوش ہوتے تھے۔ سید محمود کے سیکریٹری رہے بعد میں کلچر اتاشی کی حیثیت سے امریکا اور سعودی عربیہ کی سیر کی۔ وہاں سے تائب ہوئے تو دلّی میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے بُنیاد گزار ڈائرکٹر رہے۔ زندگی کے آخری چند سال ممبئی میں گزارے۔ یہ اُن کی زندگی کا تاریک ترین دور تھا۔ دلی میں اپنی کشتیاں جلا کر ممبئی آگئے تو یہیں کی خاک میں رل مل گئے۔ اُن کے شاعری کے دو مجموعے اشعار اور دبستان شائع ہوئے۔ اب ان کا کلیات بھی منصۂ شہود پر آچکا ہے۔ مشہور افسانہ نگار احمد یوسف اُن کے برادر نسبتی ہیں۔

بطور شاعر وہ ہمیں بیحد پسند تھے۔ ممبئی میں زوجۂ ثانی کے ساتھ اکثر ہمارے گھر آجاتے تھے۔ ''ام الخبائث'' سے وہ مرتے دم تک پیچھا نہ چھڑا سکے۔ اُن کے گُردوں نے جواب دے دیا تھا۔ علاج کے لئے جو چندہ ہوا وہ ناکافی تھا اور وہ نہایت کس مپرسی کی حالت میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنے کلام میں تا دیر زندہ رہیں گے۔

✪✪✪✪

حزن و ملال کے شاعر منیب الرحمٰن بھی علی گڑھ یونیورسٹی کے پروردہ ہیں۔ علوم شرقیہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اسلامک اسٹڈیز کے شعبے سے وابستہ تھے۔ اُردو اور پرشین ادب کو انگریزی میں منتقل کرنے کا سہرا بھی ان کے سر جاتا ہے۔ انگلینڈ چلے گئے تھے۔

اب غالباً امریکا میں رہتے ہیں۔ گراں گوشی کے ساتھ آشوب چشم کے بھی شکار ہیں، مگر مشقِ سخن جاری ہے۔

جدید اُردو نظم کی تاریخ میں اُن کا نام زرین حروف میں لکھا جائے گا۔ اردو، فارسی اور انگریزی کے اسکالر منیب صاحب نام ونمود سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ انگریزی پر قدرت کاملہ کے باوجود انہوں نے اپنی اردو نظموں کو انگریزی میں کبھی متعارف نہ کرایا۔ یہ کام دوسرں نے کیا۔ جن میں بیدار بخت، بلراج کومل نمایاں ہیں۔ ہم ملیالم کے مشہور شاعر کے سچید انندن کی مرتب کی گئی ایتھالوجی سکینچرز۔ ''ون ہنڈ ریڈ انڈین پوئٹس'' کی ورق گردانی کررہے تھے۔ کتاب میں سات اُردو کے شاعروں کو جگہ دی گئی ہے۔ یہ ہیں، علی سردار جعفری، اختر الایمان، منیب الرحمٰن، شہریار، محمد علوی، بلراج کومل اور ندافاضلی۔ سات شاعروں میں چار علی گڑھ یونیورسٹی میں کڑھے اور پڑھے ہیں۔ چونکہ ہم خود علی گڑھ کے اینٹ روڑوں میں شامل ہیں اس لئے ہمیں سرخوشی کا عجب سا احساس ہوا اور ثروت مندی کا بھی۔ لیجئے منیب الرحمٰن کی اردو نظم 'آئینہ' کا انگریزی ترجمہ پڑھ کر آپ بھی سرشار ہوجایئے۔ جس کے مترجم نارنگ صاحب ہیں!

The Mirror

At the break of day the mirror
said come on, come right ahead
what is this hesitation?
For such a long time have known you.
Why do you need an introduction?
One day an innocent baby
played and pouted before me
but perhaps you don't remeber now.

In the evening on a cold street
a shadow crawls towards me
and says come, let us go,
let us have some tea in the restaurant
and I wonder if everyone knows me here.
Sometimes I am a reflection, sometimes

a shadow wandering in search of the kernel
tryig to know who I am.
I have spent my whole life
and still I am a stranger to myself
everyone saw me, but only I
never could see my own self.

✪✪✪✪

بلدیو مرزا انگریزی کے آدمی ہیں۔ موسیقی سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ کبھی اُن کے گلے میں سرسوتی بسیرا کرتی تھی۔ ہم نے اُنہیں پہلی بار این۔آر۔ایس۔سی کلب کی کسی محفل میں غزل سرا دیکھا تھا۔ موہنی آواز تھی، انہوں نے ایسی تانیں اڑائیں کہ لوگ عش عش کر اُٹھے۔ علمِ موسیقی پر ان کے لکھے مضامین بھی یادگار ہیں۔ نہایت عمدہ براڈ کاسٹر رہ چکے ہیں۔ مرحوم سلام مچھی شہری اُن کی بڑی قدر کرتے تھے اور بڑے اہتمام سے اپنے اُردو پروگراموں میں ان کی تخلیقات کو شامل کرتے تھے۔ بلدیو نے اپنی رہائش گاہ کوٹھی ضمیر آباد میں نرسری اسکول بھی قائم کیا تھا۔ صلاح الدین پرویز کا مشہور اردو ناول ''نمرتا'' بھی انہوں نے انگریزی میں منتقل کیا تھا۔ جس کا نیا اڈیشن حال ہی میں روپا پبلشرز دلّی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ برسوں سے انگریزی میں لٹل میگزین ''اسکائی لارک'' کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ انگریزی میں شعر کہتے ہیں اور نہایت عمدہ شاعر ہیں۔ جس قدر شناسی کے مستحق تھے وہ نہ ملی۔ باہر والوں نے اُن کا اور اُن کی شاعری کا اعتراف ضرور کیا۔ یورپ ہو آئے ہیں۔ وہیں عشق پروان چڑھا جس کی یادیں اُنہیں سرشار رکھتی ہیں۔ جب تک ہم علی گڑھ میں رہے وہ اپنی محبتیں ہم پر لُٹاتے رہے۔ اکثر گھر چلے آتے تھے۔ ہم سے ان کی دوستی کا رشتہ گزشتہ نصف صدی سے اُستوار ہے۔ ان کی خوبیوں اور خوبانِ مغرب کی حکایت لذیذ قمر صاحب خاکہ کی صورت میں سپردِ قلم کر چکے ہیں۔ بلدیو مرزا پر یہ دلپذیر خاکہ ''نیا سفر'' کے کسی شمارہ میں شائع ہوا تھا۔

✪✪✪✪

ذہن کے نگارخانے میں کتنے چہرے محفوظ ہیں۔ یاد انگڑائیاں لیتی ہے تو ایک ایک کر کے نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پروفیسر ہادی حسن پرانی وضعداریوں اور شرافتوں کے قتیل فارسی اور دیگر علوم شرقیہ کے ایسے ماہر کہ دنیا میں ڈھونڈے سے اُن کا متبادل نہ ملے۔ایک تاریخی واقعہ اُن سے منسوب ہے۔ ہم نے سنا،آپ کو بھی سنائے دیتے ہیں۔ پروفسر ِگل علمِ طبیعات کے سربراہ تھے امریکا سے نیوکلرفزکس کے ماہرین علی گڑھ یونیورسٹی کے دَورے پر تشریف لارہے تھے۔اُن کی پذیرائی اور تعارفتی خطبے کے لئے پروفیسر ِگل کی نظر انتخاب پروفیسر ہادی حسن پر پڑی۔انہوں نے لاکھ تاویلات پیش کیں کہ وہ فارسی کے آدمی ہیں اُن کا نیوکلرفزکس سے کیالینا دینا۔لیکن پروفیسر ِگل اپنی ہٹ پر قائم رہے۔مجبور ہوکر قبلہ ہادی حسن نے حامی بھری۔ نیوکلرفزکس کی منتخب کتابوں کی فرمائش کی۔رات بھر استفادہ کرتے رہے۔صبح تک نیوکلرفزکس پر مقالہ تیار تھا۔

غیرملکی ماہرینِ طبیعات کے سامنے جب انہوں نے اپنا علمی مقالہ پیش کیا تو وہ خوشگوار حیرت کے ساتھ اُن کا منہ تکا کئے اور صدقِ دل کے ساتھ اعتراف کیا کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ طبیعات میں نیوکلرفزکس کے پروفیسر ہادی حسن جیسے ایکسپرٹس موجود ہیں تو یقینی طور پر یہ شعبہ دنیا کے بہترین شعبۂ جات میں شمار ہوگا۔

شاہد مہدی بھی پروفیسر ہادی حسن کے لائق شاگرد رہ چکے ہیں۔جامعہ کے وائس چانسلر تھے اب دنیا دنیا ڈھونڈتے رہئے۔ایسے نابعۂ روزگار لوگ کہاں! جامعہ کے موجودہ وائس چانسلر مشیر الحسن بھی علی گڑھ کے پڑھے ہیں ان کا سرخوں میں شمار ہوتا تھا۔

✪✪✪✪

ظہور قاسم کو جب ہم نے پہلی بار زولوجی کے لیکچر روم میں دیکھا تو انہیں دیکھ کر ہمیں صوبۂ سرحد کے دراز قدر،، سرخ و سپید پٹھان یاد آئے۔ یہ انیس سو چپن چھپّن کی بات ہے۔ مزاج میں شبنم کی ٹھنڈک تھی بیحد نرمی اور شگفتگی سے بات کرتے۔ اُن کا غیر معمولی چہرہ برسوں بعد بھی ہمارے لوحِ دل پر محفوظ ہے۔

بعد میں پروفیسر ظہور قاسم نے اُوشنوگرافی (Oceanography) میں مہارت حاصل کی اور برف زار Antarctica انٹارکٹکا کی مشکل ترین مُہم کی سربراہی کی جہاں نو مہینے دن اور تین ماہ رات رہتی ہے۔ جہاں کی سرزمین برف کے تودوں اور پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے۔ یہاں انسانوں کی آبادی نہ ہونے کے برابر ہے۔ پنچھیوں میں Penguin نام کا خوبصورت پرندہ برف زاروں میں پرواز کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں کے سفید ریچھ بھی ساری دنیا میں مشہور ہیں۔

اس برفپوش وادی کی مختصر سی آبادی نقل و حمل کے لئے سلیج (Sledge) نام کی گاڑی استعمال کرتی ہے۔ جسے کھینچنے کا کام بارہ سنگھے سے مشابہ جانور رینڈیئر (Reindeer) کرتے ہیں۔

✪✪✪✪

وسطِ ایشیا سے شمالی ہند آنے والے قافلوں میں چنگیزی قبیلے کے لوگ بھی شامل تھے۔ چنگیز خان کے بیٹے چنگا کے نام پر یہ لوگ چغتائی کہلائے۔ یہ لوگ تاجیکی زبان بولتے تھے جو فارسی، دری اور پشتو سے ملتی جلتی زبان ہے۔ یہ تاشقند اوراُس کے گردونواح کی آبادیاں تھیں جو سفر کو باعث ظفر جانتی تھیں۔اورنئی دنیاؤں کی تلاش میں اپنی ٹھنڈی وادیاں چھوڑ کر میدانی علاقوں میں آبسی تھیں۔ ہندوستان کی بادسموم کے ساتھ ساتھ یہاں کی برساتیں اور جاڑے اُن کے فوک لور (Folk lore) کا حصّہ بن چکے تھے۔اسے وقت کے بہاؤ کی کرشمہ سازی ہی کہیئے۔

یہ تو تمہید تھی۔اب ہم تشبیب کی طرف آتے ہیں۔ ہمارے گھر کی دیوار سے جُڑی ہوئی عمارت میں سراج العلوم نسوان کالج قائم تھا۔جوٹن ٹن پاڑا بالائے قلعہ کی پرشکوہ عمارتوں میں سے ایک تھی۔ اسکی تعمیر بلندی پر ہوئی تھی۔چوبی سیڑھیوں سے گزرکر ہی اسکول تک رسائی ممکن تھی۔ اسی پرشکوہ عمارت کے ایک طویل وعریض حصّہ میں ہمارا مسکن تھا۔ بلقیس آپا اسکول کی پرنسپل تھیں۔ ہماری عزیز بہنیں بھی اس اسکول سے فیضیاب ہوچکی تھیں۔ شاہدہ چغتائی، محسنہ چغتائی اور عائشہ چغتائی اسکول میں پڑھاتی

تھیں۔ ان کا ایک بھائی توصیف چغتائی بھی تھا۔ جو کہانیاں لکھنے کے شوق میں اکثر ہمارے پاس آتا رہتا تھا۔

جب یہ تینوں بہنیں اسکول کی سیڑھیوں پر قدم دھرتیں تو ہم آہٹ سے پہچان لیتے کہ شاہدہ باجی اپنی چندے آفتاب اور چندے ماہتاب بہنوں کے ساتھ آگئی ہیں۔ یہ لوگ نقاب اُٹھا کر جب اسکول کے داخلی دروازہ میں داخل ہوتیں تو ہم نگاہیں بچا کر اُنہیں دیکھ لیتے۔ اس وقت ہم اٹھارہ انیس برس کے تھے یہ ہمارا ذوق جمال تھایا کچھ اور اسکی توضیح اور وضاحت ہمارے بس کی بات نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان کے تابندہ چہرے آج بھی ہمارے وجود کو جگمگاتے رہتے ہیں۔ شاہدہ باجی ہماری بہنوں کے پرائیویٹ ٹیوٹر مسعود صاحب سے شادی کر کے پاکستان چلی گئیں۔ توصیف، محسنہ اور عائشہ بھی اُن کے ساتھ نقلِ مکانی کر گئے۔

محسنہ کو کہانیاں لکھنے کا شوق تھا۔ اُن کی چند کہانیاں ماہنامہ ''سریتا'' میں ہم نے پڑھی تھیں۔ بعد کے دنوں میں اُن کی کہانیاں ''شمع'' میں بھی شائع ہوئیں۔ محسنہ آجکل لندن میں ہیں، اُن کے شوہر جنگ اخبار کے کالم نویس ہیں، جو بیک وقت لندن اور کراچی سے شائع ہوتا ہے۔ حال میں محسنہ چغتائی کے افسانوں کا مجموعہ ''بکھرے ہوئے لوگ'' شائع ہوا ہے۔ کبھی کبھی پاکستانی رسائل میں اُن کی کوئی تحریر نظر آتی ہے تو ہم بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ خدا خوش رکھے بہت اچھے لوگ تھے۔

✪✪✪✪

کرنل ممتاز ہمارے فیملی فرینڈ ہیں یہ بھی علیگ ہیں۔ اُن کی معرفت ہماری ملاقات لیفٹیننٹ جنرل سمیع خاں سے ہوئی۔ ہمارے گھر کے نزدیک ہی گومتی نگر میں اُن کی رہائش تھی۔ یہ اُن کی کرم فرمائی تھی کہ کبھی کبھی ہمارے گھر تشریف لے آتے تھے۔ یہاں سینٹرل کمانڈ کے سربراہ رہے۔ جموں کشمیر میں گورنر کے ایڈوائزر بھی رہے تھے۔ ہم اپنی معصومیت میں اُن سے کافی بے تکلف ہو گئے تھے۔ مزے مزے سے ہماری باتیں سنتے اور محظوظ ہوتے۔ عمدہ کھانوں کے شوقین تھے۔ خاص طور سے کڑھاؤ کا گوشت انہیں

بہت پسند تھا۔ پٹھانوں کی بستی رام پور اُن کا وطن تھا۔ آتے جاتے رہتے تھے۔ اور بڑے شوق سے دعوتوں میں شریک ہوتے تھے۔ بیگم صاحب بھی نفیس ذوق کی خاتون ہیں۔ اچھی کتابیں پڑھنے کی شوقین نسبتاً سنجیدہ رہتی ہیں، ہنسی یا قہقہے کے بجائے لب خنداں کی قائل ہیں۔

ایک دن باتوں باتوں میں علی گڑھ کا ذکر نکل آیا۔ جنرل صاحب نے ہمیں بتایا کہ بہ غرض تعلیم وہ علی گڑھ میں رہ چکے ہیں۔ یعنی علی گڑھ کے اولڈ بوائے ہیں۔ یہ مژدہ جانفزا سُن کر ہماری تو باچھیں کھل گئیں۔

حال میں محمود الرحمٰن صاحب سے فون پر بات ہو رہی تھی۔ جنرل صاحب کا ذکر نکل آیا تو انہوں نے ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جنرل صاحب کے والد جمیل خان صاحب نہایت وجیہہ شخصیت کے مالک تھے۔ پولیس میں اعلا افسر تھے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کی بہن راجیشوری نہرو کی محبت کی شادی جمیل خاں صاحب سے ہوئی تھی۔ یہ اُن کی زوجۂ ثانی تھیں، اُن کی دو لڑکیاں ابھی کچھ سالوں پہلے تک بقید حیات تھیں۔

جنرل صاحب کوئی خاص بیمار نہیں تھے۔ ہم ممبئی گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو کرنل ممتاز نے یہ جان کاہ خبر سنائی کہ سینٹرل کمانڈ کے آرمی ہاسپٹل میں اچانک اُن کا انتقال ہو گیا۔ بظاہر اچھے بھلے تھے۔ موت سے کس کو رُستگاری ہے۔ جانے کے تو بہانے ہوتے ہیں۔ خدا نے بلایا اور وہ چلے گئے۔ اُن کا ہنستا ہوا نورانی چہرہ نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے تو اُن کی یاد آئے چلی جاتی ہے۔

☆

ریٹائرڈ میجر جنرل قاضی متین صدیقی ہماری کالونی ایلڈ یکو گرین میں رہتے ہیں۔ طیّب جی کے زمانے میں علی گڑھ سے انجینئرنگ کر کے فوج میں چلے گئے۔ سبکدوش ہونے کے بعد یادِ الٰہی میں مصروف ہیں۔ متشرع آدمی ہیں، بیگم صاحب کے ساتھ ابھی گزشتہ برس ہی حجِ اکبر کا فریضۂ احسن ادا کر کے آئے ہیں۔ جو مکمل مشرقی خاتون

ہیں،صوم صلوٰۃ کی پابند! جنرل صاحب کی پیشانی عبادت کے نور سے روشن رہتی ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے سے اپنی موٹر ڈرائیو کرتے ہوئے گزرتے ہیں تو ہمیں پورٹیکو میں دیکھ کر تقریباً ہنستے ہوئے ہاتھ ہلاتے ہیں۔

خورجہ کے اسرار رحیم خان صاحب ہمارے یار غار تھے بلکہ ہیں۔ سلیمان ہال میں رہتے تھے ۱۹۶۲ء میں انہیں فوج میں کمیشن مل گیا۔ یہ زقندیں بھرتے ہوئے بریگیڈیئر کے عہدے تک جا پہنچے۔ خان صاحب میں اک ذرا ''ارسٹوکریسی'' تھی اور کیوں نہ ہو اشرافیہ تو ہیں ہی۔ تھوڑا بہت نقشہ بازی کا بھی شوق تھا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ہم اور اسرار خان مولانا آزاد لائبریری کی کینٹین میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ سامنے سے کالی اچکن پہنے کوئی رامپوری پٹھان مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ آگے سے اچکن کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اسرار نے انہیں آواز دے کر اپنے نزدیک بلالیا اور اُن کا نام پتہ پوچھ کر انہیں تلقین کی ''شیروانی کے پورے بٹن لگایئے یہ یہاں کی روایت ہے۔جس کا احترام لازم ہے۔'' جمیل خاں رامپوری نے ہدایتِ خاص پر فوراً عمل کیا اور آداب کر کے جانے کی اجازت چاہی۔

اسرار نے شگفتہ لہجہ میں کہا ''نہیں تشریف رکھئے چائے آرہی ہے۔ پھر جایئے گا''۔

نمائش کے دن تھے۔ اسرار رحیم خان شکیلہ بانو بھوپالی کی قوّالیوں کے عاشق تھے۔ گھر آئے، ہماری امّاں کو آواز دے کر کچھ کھانے کی فرمائش کی۔ انہوں نے اصلی گھی میں بنی ہوئی باجرے کی خستہ ٹکیاں ایک طشت میں رکھ کر بھجوادیں۔ اسرار خاں نے مزے لے لے کر کھائیں اور زبان چٹخارتے ہوئے بولے۔ کیا لذیذ ٹکیاں بنائی ہیں آپ نے بوا۔ تھوڑی سی پڑیا میں باندھ دیجئے۔ہم ہوسٹل لے جائیں گے۔''

اور پھر اصل مطلب پر آتے ہوئے بولے۔ ''یار فیاض آج شکیلہ بانو بھوپالی کی قوالیاں ہیں۔ چلنا ضرور ہے۔''

پروگرام کے مطابق شام کو اسرار نمائش گاہ آگئے۔ مزمّل گیٹ سے بارہ دری کے

پھیرے لگائے، جدھر دیکھئے کالی شیروانیوں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ سبھی شکیلہ بانو بھوپالی کی قوّالی سے محظوظ ہونا چاہتے تھے۔ حسینوں کے جمگھٹے، شوقِ نظارہ کو ہوا دے رہے تھے۔ حسن و عشق کی دھواں دھواں کہانیاں رقم ہو رہی تھیں۔ اندر سبھا سجی ہوئی تھی۔ حسین خوابوں بھری دنیا سے نکل کر ہم لوگ اپنی اشتہا کی تسکین کے لئے سہارنپور کے مشہور ترین سینٹرل ہوٹل میں جا بیٹھے۔ سیر ہو کر شکم پروری کی، وہاں کا حلوہ پراٹھا، قورمہ اور سیخ کباب بے شمار ذائقوں کے احساس کو جگا رہے تھے۔

جب شب نے انگڑائی لے کر اپنی قیامت جگاتی جوانی کا اعلان کیا تو ہم لوگ خراماں خراماں دربار ہال کی طرف بڑھے۔ ہجوم کا سمندر تھا، جو کُشاں کشاں بے تابیٔ شوق کو سینے میں دبائے، حسن کی بارگاہ ناز میں اپنی موجودگی درج کرانے کے لئے رواں دواں تھا۔

ہم لوگ بڑے آرام سے وی۔ آئی۔ پی گیٹ تک پہنچ گئے۔ بس ہم اندر داخل ہوا چاہتے تھے کہ سوٹ پہنے ہوئے ایک شخص نے بڑی نرمی کے ساتھ ہمیں روکتے ہوئے پوچھا۔ ''حضور آپ کا ٹکٹ کہاں ہے''۔

ہم نے اُن پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''حضرت آپ ہمیں روکنے والے آخر ہیں کون'' انہوں نے نہایت شرافت سے جواب دیا۔ ''مان لیجئے ہم کہیں کہ ہم یہاں کے ڈی۔ ایم ہیں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔''

''درست، لیکن ہم شکیلہ بانو کی قوالی ضرور سنیں گے۔ ہم اکیلے نہیں ہیں دو سولڑ کے ہمارے ساتھ ہیں''۔

''جی وہ تو ہم دیکھ رہے ہیں لیکن شائد آپ کی نظر پی۔ اے۔ سی کے جوانوں کی طرف نہیں گئی جو ہمارے ایک اشارے پر لاٹھی اور ڈنڈوں سے آپ اور آپ کے حواریوں کے ساتھ مکالمہ آرائی شروع کر دیں گے۔''

ہم نے اُن کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اک ذرا پیچھے ہٹ کر ہم نے اپنے ساتھیوں کو للکارا۔ دیکھ کیا رہے ہیں گھس جائیے اندر۔ اُدھر ڈی۔ ایم کی آواز ہمارے

کانوں میں آئی۔ ''لاٹھی چارج'' ۔۔ پلک جھپکتے ایک ریلے میں کچی دیوار کا تھوڑا سا حصہ ٹوٹ گیا۔ ہم اور اسرار رحیم ہال کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ ہمارے کچھ اور ساتھی بھی کمر اور ٹانگوں پر وار سہتے ہوئے در آئے تھے۔ چونکہ ہم پی۔اے۔سی والوں کے نشانے پر تھے۔ کمر پر دو چار ایسی لاٹھیاں پڑیں کہ رقص بسمل کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ رہا۔ مستقبل کے بریگیڈئر اسرار رحیم خاں بھی ہنستے ہوئے اپنی کمر سہلا رہے تھے۔

رات بھر قوالیوں سے محظوظ ہوئے گھر جا کر دیکھا تو پورے بدن پر نیلے نشان پڑے ہوئے تھے۔ خاں صاحب نے صبح کے ناشتہ میں مکھن مٹری کے ساتھ بیرے سے فرمائش کی کہ ''تھوڑی سی ہلدی بھی لائیے۔''

✪✪✪✪

صلاح الدین پرویز کے والد جبار صاحب ایک سیدھے سچے مسلمان تھے۔ پرائیوٹ ٹیوشن کر کے اپنی گھر گرہستی چلاتے تھے۔ کچھ دنوں انہوں نے ہماری بہنوں کو بھی پڑھایا۔ معاشی دُشواریوں کے باوجود وقت کی نبض پر اُن کا ہاتھ تھا۔ مستقبل شناسی کے جوہر یکتا نے ذہن کے دریچوں میں توانائی اور روشنی کی ایسی قندیل روشن کی کہ اُن کے بڑے بیٹے نے کمپیوٹر انجینئرنگ کے شعبہ میں ماہرانہ ہنرمندی کا نشانِ امتیاز قائم کیا۔

پرویز نے میڈیکل کی تعلیم چھوڑ کر انگریزی ادبیات کے دامن میں پناہ لی۔ انہیں بچپن سے حرف ومعنی کی جستجو تھی۔ آغاز بچوں کی کہانیوں سے کیا۔ بہت ابتداء میں ہم سے بھی اصلاح لی۔ مگر اُن کے معنوی استاد اسلوب احمد انصاری ہیں۔ اُن کی ذہنی اُپج کو زرخیزی عطا کرنے میں علی گڑھ کا زرخیز ادبی ماحول بھی ہے۔ جہاں شعر وسخن کے چمن زار میں نئے گل بوٹے پروان چڑھ رہے تھے۔

ایک دن ہانپتے کانپتے ہوئے پرویز نے محمد علی روڈ پر ہمیں روک کر نظموں کی چھوٹی سی کتاب ''ژاژ'' ہماری نذر کر دی۔ نام کی ندرت سے ہم شاد کام ہوئے۔ پھر انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ''کنفیشن''، ''سبھی رنگ کے ساون''، ''پرماتما کے نام آتما کے

پتر'' اور پھر ''دشتِ تحیرات'' یہ اُن کی ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۸ء تک کی نظموں کا انتخاب ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو ایسی وفور انگیز قلندرانہ شان عطا کی ہے کہ پڑھنے والا جذب و جمال کی روحانی دنیاؤں میں کھو جاتا ہے۔ ہندایرانی خمیر سے اُٹھی اُن کی تخلیقی لہریں ہمارے وجود کو سرشاری و سرمستی کے جہانِ تازہ کی سیرابی سے ہمکنار کرتی ہیں۔ وہ بدن سے زیادہ روح کے شاعر ہیں، اُن کی شاعری کا رمز روحانی کشف و کرامات کی ماورائی کائنات کا اظہاریہ بن کر ہمارے آلودہ نفس کی تطہیر کرتا ہے۔ ''کتاب عشق'' صلاح الدین پرویز کی طویل نظم عشق، وجود، نمودِ ہستی اور دوئی کی تحلیل کے مناظر دلپذیر انداز میں پیش کرتی ہے۔ ہم جیلانی کامران کے اس بیان سے مکمل طور پر متفق ہیں کہ عجمی شعری روایت ''کتابِ عشق'' کے ذریعہ دوبارہ زندہ ہوئی ہے۔

ابھی پرویز کا سفرِ عشق جاری ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ منتائے کمال کو پہنچیں گے۔

✪✪✪✪

محمود بھائی حکومت کشمیر میں زراعت سیکریٹری تھے۔ راج باغ میں اُن کی رہائش تھی۔ ہم بھی اُن کے نزدیک لداخی کالونی میں رہتے تھے۔ ہم نے انہیں ریڈیو میں بات چیت کے لئے مدعو کیا۔ نہایت عمدہ براڈ کاسٹر ثابت ہوئے۔ ہم انہیں تواتر کے ساتھ بلانے لگا۔ ہم اُن سے اور وہ ہم سے مانوس ہوتے گئے۔ اکثر ہمیں دعوت پر اپنے گھر بلا لیتے۔ ایسی ہی ایک دعوت میں انہوں نے ہماری وجاہت حبیب اللہ سے ملاقات کرائی جو آجکل چیف انفارمیشن کمشنر ہیں۔

محمود بھائی وائس چانسلر بن کر علی گڑھ تشریف لائے تو ہمیں بہت چھالگا۔ ہم اُن سے ملنے اور مبارکباد دینے وائس چانسلر لاج پہنچے، جیسے ہی اطلاع ہوئی فوراً بلوالیا۔ رمضان کے روزے چل رہے تھے۔ ہم اللہ کے گنہگار بندے بغیر روزے کے تھے۔ اور وہ دیندار پنج وقتہ نمازی، ہم سے جھوٹ بھی نہ بولا گیا۔ انہوں نے بیرے کو آواز دے کر ہمارے لئے ڈرائی فروٹس منگوادئے اور ہم سے کھانے کے لئے اصرار کیا۔ ساتھ ہی ہنستے

ہوئے کہا'' بھئی آپ کھانا شروع کریں، باتیں بھی ہوتی رہیں گی اور ہمارے روزے کی آزمائش بھی!

انہی کی ایما پر ہمیں شعبۂ صحافت سے منسلک عزیزی شافع قدوائی نے بطور اکسٹرنل ایگزامنر مدعو کیا۔ ہمیں اولڈ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ بھئی ہم وائس چانسلر کے مہمان جو تھے۔

بھائی محمودالرحمٰن کو بنارس ہندو یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی تو ہم نے ان کی آدھے گھنٹے کی ریکارڈنگ کرائی۔ پھر تو ہمارا معمول ہوگیا۔ یونیورسٹی کی تہذیبی سرگرمیوں کی کوریج کے لئے اپنی کیمرہ ٹیم خصوصی طور پر بھیجتے۔ غرض کہ ہمیں موقع کی تلاش رہتی کہ ہم اپنی دانش گہہِ علم وفن کو ہائی لائٹ کرنے میں کوئی کور کسر نہ چھوڑیں۔

محمودالرحمٰن اپنے اظہار میں نہایت نرم گفتار ہیں۔ مگر ایک اعلا منتظم کار ہونے کے ناطے، جہاں ضرورت ہوتی ہے وہ سخت گیر بھی ہوجاتے ہیں۔ انتظامیہ کی مجبوریوں کے تحت انہوں نے چھ سولڑکوں کا یونیورسٹی سے اخراج کردیا۔ بقول اُن کے یہ سبھی واہیات اور شرانگیز لڑکے تھے۔ جرم ان کی سرشت میں تھا۔ نان ٹیچنگ اسٹاف میں آٹھ ہزار لوگ شامل ہیں۔ جو کام کرنے کے بجائے وائس چانسلر کے لئے دردِ سر بنے رہتے ہیں۔ آئے دن اسٹرائیکس کرتے ہیں۔ تا کہ انتظامیہ پر اُن کا دباؤ بنا رہے۔ بیشتر کام کرنے کے بجائے محض حاضری لگانے آتے ہیں۔ میڈیکل کالج کا بُرا حال تھا۔ دیواروں پر پان کی سرخ پیک سے نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔ حفظانِ صحت کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ سینی ٹیشن (Sanitation) کس چڑیا کا نام ہے لوگ یہ جانتے ہی نہ تھے۔ علاج میں بھی بے اعتنائی برتی جاتی تھی۔ محمود صاحب کے آتے ہی صاف صفائی کے کام میں باقاعدگی نظر آنے لگی۔ علاج معالجے میں بھی درستی کے آثار نظر آنے لگے۔ درجہ چہارم کے ملازم وقت سے آتے اور پوری ڈیوٹی کر کے جاتے۔ غنڈہ گردی کا صفایا ہوگیا۔ تعلیمی ماحول خوب سے خوب تر ہوتا گیا۔ محمود صاحب نے زمین مافیاؤں کے گرد شکنجہ کسنا شروع

کیا۔ یونیورسٹی کی دوڈھائی سوگز زمینوں سے ناجائز قبضے ہٹائے اور واگزار کرایا۔ ''باب سرسید'' کی تعمیر کرائی۔ یقینی طور پر یہ اُن کا زرین کارنامہ تھا۔

بدعنوان لوگوں کی ایسی نکیل کسی کہ وہ یونیورسٹی چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرنے پہ مجبور ہوئے۔ زمین ہتھیانے کی مذموم کوششوں میں یونیورسٹی کے بعض ارباب حل وعقد بھی شامل تھے۔ اُن کی سرزنش کی۔ وائس چانسلر آفس کے گرد منڈلانے والی خواتین کو محمود بھائی نے دور سے سلام کرلیا۔ سابق وائس چانسلروں کے منہ لگے نام نہاد کمیونسٹوں اور جماعت اسلامی کے حلقہ بگوشوں کی راسیں کسیں۔ یونیورسٹی کے نام پر وسطِ ایشیا کے ملکوں کا دورہ کرنے والے چندہ خوروں کو معتوب کیا۔ محمود بھائی اقبال کے شیدائی ہیں۔ ہم یونیورسٹی کی خرابیوں پر اُن سے بات کررہے تھے۔ انہوں نے بے ساختہ یہ شعر پڑھا۔

ہے ساز پر موقوف نواہائے سوز جگر
ڈھیلے ہیں اگر تار تو بیکار ہے مضراب

✪✪✪✪

دنیا

شہاب جعفری شعبۂ اُردو کے کاریڈور میں اکثر نظر آتے تھے۔ ہمارا اُن سے تعارف ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ نئے لکھنے والوں کا دل بڑھاتے تھے۔ ہماری بھی ہمت بڑھائی۔ اب ہمیں ٹھیک سے یاد نہیں وہ ایم۔اے کے آخری سال میں تھے یا پی۔ایچ۔ڈی کے لئے این رول ہو چکے تھے۔ اکثر خلیل صاحب اور جذبی صاحب کے ساتھ نظر آتے۔ خوش اخلاق تو خیر وہ تھے ہی دل کے بھی سونا تھے۔ بے غرض اور بے ریا بس اک ذرا لااُبالی تھے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی جاوید کمال، منیب الرحمٰن، امین اشرف، راہی وغیرہ کے ساتھ اُن کا نام بھی شاعروں کی فہرست میں خاصہ نمایاں اور ممتاز تھا۔ غزل اور نظم دونوں اصناف میں اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ شہاب جعفری کو تھیٹر سے بھی خصوصی دلچسپی تھی وہ اداکار بھی بہت اچھے تھے۔ انہوں نے ریڈیو کے لئے فیچر بھی لکھے جو بیحد مقبول ہوئے۔ جن دنوں کی ہم بات کر رہے ہیں ترقی پسند ادیبوں کا طوطی بول رہا تھا۔ شہاب جعفری نے نظم و نثر میں اپنی الگ راہ نکالی تھی۔ یونیورسٹی کے اطراف و اکناف میں اُن کی شہرت کا سورج نصف النہار پر تھا۔ اُن کا ایک شعر تو پورے ہندوستان میں ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ آپ لوگ بھی سن لیں۔

چلے تو پاؤں کے نیچے کچل گئی کوئی شے
نشے کی جھونک میں دیکھا نہیں کہ دنیا ہے

علی گڑھ سے سیکنڈ ڈویژن میں ایم۔اے کر کے شہاب جعفری نے دلی کے لئے رخت سفر باندھا، دیال سنگھ کالج میں بطور لیکچرر اُن کا تقرر ہو گیا۔ چھیاسٹھ میں ہم دلّی گئے، ایک دن شعبۂ اُردو میں ہم شہاب جعفری سے ٹکرا گئے۔ انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی گلے لگا لیا۔ حال احوال پوچھا۔ آرٹس فیکلٹی کی کینٹین میں لے جا کر چائے پلائی۔ اور

ازراہِ تلطف اپنے شعری مجموعے ''سورج کا شہر'' کا ایک نسخہ ہمیں عنایت کیا۔ یہ اُن کا پہلا اور آخری شعری مجموعہ تھا۔ جس نے سورج کی روشنی دیکھی۔

جب تک ہم دلی میں رہے ہم پر محبتیں لٹاتے رہے۔ جن دنوں وہ ماڈل ٹاؤن میں الپنا تھیئٹر کے پیچھے، جھیل کے نزدیک کشادہ فلیٹ میں رہائش پذیر تھے۔ ہم اُن سے ملنے گئے تو وہاں حسن نعیم سے بھی ملاقات ہوگئی جو بڑے کروفر کے ساتھ گیسوئے غزل کو مشاطگی بخش رہے تھے۔ اُن کی فرمائش پر اور ہمارے اصرار پر شہاب جعفری نے اپنی مشہور نظم ''سورج کا شہر'' سنائی۔ اس کا ایک بند لکھ رہے ہیں کہ آنے والے دنوں میں نئے اذہان کو روشنی اور توانائی عطا کرتا رہے۔

بچے کھچے اک ورق پہ کچھ یوں لکھا ہوا تھا:
''میں اپنی دنیائے فکروفن تج کے آج بن باس
میں پڑا ہوا ہوں
ضرورتوں میں گھرا ہوا ہوں
یہاں تو دو اور دو کا حاصل ہمیشہ ہی چار ہاتھ آیا
کہ پانچ ناممکنات میں ہے
عظیم فنکار کا قلم ہو کہ کارخانے!
کسی کو تخلیقِ حُسن کی آرزو نہیں ہے
مقدس آگ اُن کے دل کی یوں پیٹ کے
جہنّم میں جل رہی ہے
کہ زندگی کی جو قوتیں ہیں وہ صرف زندہ ہی
رہنے میں صرف ہو رہی ہیں
مشین کی طرح ذہن بھی کام کر رہے ہیں
رگوں میں جیسے لہو کے بدلے رقیق لوہا بھرا
ہوا ہے

مشین کی طرح پاؤں چلتے ہیں
آدمی کا جلال گردش میں سُرنگوں ہے
ارادہ واختیار اک اضطرابِ سنگین ہے
جس سے بچ کر
کوئی نہیں دو گھڑی کسی سے جو بے غرض رک
کے بات کرے
(کسے خبر؟ آدمی کے دو میٹھے بول کو میں ترس گیا ہوں!)''

✪✪✪✪

کبیر احمد جائسی بی۔اے میں ہمارے ساتھ تھے۔ پڑھائی کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی سنجیدہ تھے۔اُردو کے ساتھ عربی اور فارسی بھی اُن کے محبوب مضامین تھے۔ہم لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے فارسی کا ایک آدھ شعر بھی ٹھونک دیتے تھے۔ حافظ و شیرازی ہمارے نصاب میں شامل تھے۔بس اُن کی چند غزلیں تھیں جن کے معنی و مفاہیم کو ذہن نشین کرنا تھا۔ ہم فارسی سے تقریباً نابلد تھے۔ وہ تو فارسی میں ایک پہیلی تھی جو بچپن میں ہمارے چچانے ہمیں یاد کرادی تھی جسے موقع بے موقع پڑھ کر ہم اپنی آبرو بچالیتے تھے۔آپ لوگ بھی سماعت فرمائیے۔اور ہماری ہمہ دانی پر ایمان لے آئیے۔

رفتم بسوئے خانۂ دیدم عجب تماشا
تعجب ایں قدر دارد کہ او بر پشت دم دارد

جبکہ کبیر کا عالم یہ تھا کہ وہ حافظ کے حافظ تھے اور اُن کا بیشتر وقت دارالمطالعہ میں گزرتا تھا۔ کتابوں کو انھوں نے اپنا اوڑھنا، بچھونا بنا رکھا تھا۔ ہمارے مشاغل کا دائرہ کار بہت پھیلا ہوا تھا۔ یونین کی تہذیبی، غیر تہذیبی سرگرمیوں میں حصہ لینا ہمیں نہایت مرغوب تھا۔ نقشے بازی بھی عزیز تھی، چائے خانوں میں تصنعِ اوقات بھی ہماری عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ پڑھتے تو ہم بھی تھے مگر غیر درسی کتابیں ہمارے لئے زیادہ باعث کشش تھیں۔ فسانہ گوئی بھی کرتے تھے۔ دوستوں یاروں کے ساتھ پھڑ لگانا بھی ہمیں

عزیز تھا۔ غرض کہ اونٹ کی طرح ہماری کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ جبکہ کبیر احمد جائسی کی اکہری شخصیت محض اور محض علم کی جویا تھی۔ ہمارے اور اُن کے درمیان ایک ہی چیز مشترک تھی! شعروادب سے والہانہ لگاؤ! خیر سے کبیر شاعر بھی تھے اور غالباً صہبا یا صبا تخلص کرتے تھے۔ اکثر مزے مزے کے شعر سناتے۔

بی۔اے میں پانچ سات نمبروں سے ہماری فرسٹ کلاس رہ گئی۔ اُردو کے مضمون کی حد تک کبیر کے ساتھ مسابقت رہتی تھی۔ ٹوریل میں غالباً ہمارے نمبر اُن سے زیادہ تھے۔ بطور مضمون بھی ہم نے کلّی طور پر امتیازی نمبر حاصل کیے تھے۔ اگر ہماری یادداشت دھوکہ نہیں دے رہی تو کبیر کی فرسٹ ڈویژن آئی تھی۔ اُن کی محنت شاقہ رنگ لائی۔ ہم سے یونیورسٹی چھڑادی گئی۔ کبیر گاؤں کی پن چکی کی طرح اپنی دُھن میں لگے رہے، شاعری کی لے مدّھم ہوتی گئی۔ تحقیق و تدقیق کی دنیا میں وہ گلے گلے ڈوبتے چلے گئے۔ مسلسل تگ و دو کے بعد وہ درس و تدریس کے پیشے سے جُڑ گئے۔ یہی اُن کا خواب تھا، جو پورا ہوا۔ ورنہ ہم تو سمجھے تھے کہ

دیکھے یہ قدرت کے کھیل
پڑھیں فارسی اور بیچیں تیل

کبیر نے اس مقولے کو غلط ثابت کردکھایا اور فارسی پڑھ کر اصفہان اور شیراز جا پہنچے۔ علی گڑھ آئے تو یہاں کی مٹی نے پکڑ لیا۔ پروفیسر کے عہدۂ جلیلہ سے سبکدوش ہوکر علی گڑھ کی دھول مٹی اور مچھروں کے ساتھ مجاہدے میں مصروف ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ مشقِ سخن بھی جاری ہے۔ ''چکّی کی مشقت سے تو چھوٹے''۔ اقبال اور حافظ پر ان کا عالمانہ مضمون (مطبوعہ اردو ادب) ان کی ادبی شناخت کا ضامن ہے خدا انہیں سلامت رکھے۔ بوقلمونی دنیا کے معرکۂ خیروشر میں وہ ہمیشہ ظفریاب رہیں۔

گوہرِ گرانمایہ

''۱۹۴۰ء کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں سیاست کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی تھی۔ روایت سے بغاوت کے آثار نمایاں ہونا شروع ہوگئے تھے۔ نظریاتی کشمکش کے آثار بھی دکھائی دینے لگے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک شاخ علی گڑھ میں قائم ہوچکی تھی۔ پہلا جلسہ ٹونکی صاحب کے گھر پر ہوا۔ اس جلسہ میں جذبی صاحب، خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی، انور انصاری، مولانا یوسف، مونس رضا، خورشید محمد صاحب ٹونکی، ان کے صاحبزادے عزیز ٹونکی اور نسیم انصاری موجود تھے۔ یہ ۴۵ء کے شروع کا زمانہ تھا۔''

مولانا یوسف اور سید محمد ٹونکی کے نام تو ہم بار بار سنتے آئے تھے ممکن ہے ان لوگوں کو دیکھا بھی ہو۔ جن دنوں ہم یونیورسٹی میں فرسٹ ایئر سائنس کے طالب علم تھے، ٹونکی صاحب منٹو سرکل کے پرنسپل تھے۔ جب ہم سائنس چھوڑ کر آرٹس میں چلے گئے تو خلیل صاحب، جذبی صاحب، انور انصاری اور مونس رضا جیسے بڑے لوگوں نے ہمیں زندگی کا سبق یاد کرایا۔ پروفیسر انور انصاری ہمیں سائیکلوجی پڑھاتے تھے، مونس رضا جنرل ایجوکیشن کے شعبہ سے وابستہ تھے۔ ہمارے لکھنے لکھانے کی عادت کی وجہ سے ہمیں خوب جان گئے تھے۔ بعد میں جے۔ این۔ یو اور دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے، مگر اُن کے خلوص میں کوئی کمی نہ آئی۔ وہ پرانے جوش وخروش کے ساتھ ہمارا دل بڑھاتے رہے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں مونس رضا افسانے لکھتے تھے اور باقاعدگی سے انجمن کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔

خورشید صاحب روشن ذہن رکھتے تھے اُن کا تاریخی شعور بالیدہ تھا۔ وقت کی بدلتی ہوئی کروٹوں پر اُن کی نظر تھی۔ پان سلام ازم کی تھیوری ناکام ہوچکی تھی۔ ساری دنیا کے

اسلام پر مغربی طاقتوں کا قبضہ تھا۔ مارکس کی جدلیاتی مادیت پر لوگ ایمان لا رہے تھے۔ جسے بے راہ روی اور دہریت سے منسوب کیا جارہا تھا۔

خورشید الاسلام کا جب یونیورسٹی میں تقرر ہوگیا تو وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاالدین احمد نے گھر بُلا کر انہیں تلقین کی۔ ''دیکھئے خورشید صاحب آپ کا تقرر ہوگیا ہے لیکن خیال رہے کہ یہ مسلم یونیورسٹی ہے! یہاں خدا اور وائس چانسلر کے متعلق کچھ کہنے میں احتیاط سے کام لیجئے گا۔''

خورشید صاحب آزاد منش تھے۔ انہوں نے اپنی روشن خیالی کو مرتے دم تک نہ چھوڑا۔ علم و فضل کی دنیا میں اُن کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ وہ تحریر و تقریر کے بادشاہ تھے۔ اُن کی نثر کا دبدبہ تو مولانا آزاد بھی مانتے تھے اور مولوی عبدالحق بھی۔ ہم اُن کے طالب علم رہے ہیں ہمارے لئے یہی بہت بڑا اعزاز ہے۔ پڑھاتے کیا تھے، جادو کرتے تھے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے کہیں لکھا ہے وہ اپنے وقت کے نابغۂ روزگار سمجھے جاتے تھے اُن کی چھوٹی سی کتاب ''تنقیدیں'' ہمیں آج بھی بہت عزیز ہے۔ ہم اُنہیں اپنا آئیڈیل جانتے ہیں۔ خورشید صاحب نثری نظم کے بھی بے مثال شاعر تھے۔ اُن کا نثری نظموں کا مجموعہ ''جستہ جستہ'' بیحد مقبول ہوا تھا۔ انگریزی میں اُن کی کتاب تھری مغل پوئٹس (Three Mughal Poets) ایک دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ ادھر گزشتہ پچیس تیس برسوں میں اُن کی کوئی قابلِ ذکر تحریر نظر نہ آئی۔ عمر کے آخری دور میں وہ تنہا پسند ہوگئے تھے۔ ادبی جلسوں میں بھی نظر نہیں آتے تھے۔ اُنہیں وہ شہرت بھی نہ ملی، جو اُن کے کوتاہ قد ساتھیوں کو حاصل ہوئی۔ منصب کے اعتبار سے بھی وہ پیچھے رہ گئے۔ معصوم سرشت آدمی تھے۔ سیاسی جوڑ توڑ اور ریشہ دوانیوں سے ہمیشہ اپنا دامن بچاتے رہے۔ زیاں کا سودا عزیز تھا کہ کُلاہ کج نہ ہو۔

الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں پروفیسر شپ کے لئے خورشید الاسلام بھی اُمیدوار تھے۔ سیّد احتشام حسین کا تقرر عمل میں آیا۔ ''جواب باقی ہیں'' میں سرور صاحب سے اسکا ذکر کیا ہے جس پر اسلوب صاحب کا ردِ عمل ملاحظہ فرمائیے۔

.....''مصنف کا یہ کہنا کہ ہم نے یعنی انتخابی کمیٹی نے الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں سیّد احتشام حسین کا بہ حیثیت پروفیسر تقرر کیا تھا۔ (صفحہ ۱۴۸) بجا اور درست ہے اور احتشام حسین صاحب کی قدر ومنزلت اپنی جگہ، لیکن اس کے فوراً بعد یہ یاد دہانی کہ ڈاکٹر خورشید الاسلام بھی اس جگہ کے لئے امیدوار تھے، بڑی حد تک قابل گرفت۔ اس لئے کہ اوّل تو انتخابی کمیٹی کے تفاعل کی اخلاقیات کے منافی ہے کہ اس کی کارروائی کو اس طرح طشت از بام کیا جائے اور دوسرے اس میں خورشید الاسلام جیسے باکمال انشاپرداز، صاحبِ ذوق اور بالغ نظر نقاد اور شاعر اور توانا ذہن رکھنے والے کے لئے جس کا تخلیقی اور تنقیدی کام منتخب کرنے والوں اور منتخب شخص سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے سُبکی کا پہلو نکلتا ہے۔''

✪✪✪✪

بشیر بدر ایم۔ اے کرنے علی گڑھ آئے تو ہم بہت خوش ہوئے۔ ہم نے اُن کی ہمت کی داد کی۔ بیوی بچے بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے اعلا تعلیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے واقعی عزم صمیم اور استقامت کا ثبوت دیا تھا۔ یوں تو علم کی تحصیل کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں لیکن برسوں پولیس میں منشی گیری کرنے کے بعد از سرنو خود کو سمیٹ کر پڑھنے لکھنے کے لئے اُڑان بھرنا آسان کام نہیں۔

انہوں نے جلد ہی علی گڑھ کی تعلیمی اور تہذیبی فضا میں خود کو جذب کرلیا۔ ایم۔ اے۔ کیا اور جدید غزل پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا کام شوع کردیا۔ مشہور تو وہ پہلے ہی سے تھے۔ علی گڑھ کے ادبی حلقوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مشاعرہ کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اُن کا گھر یونیورسٹی کے اطراف میں کہیں تھا کبھی کبھی ہم اُن کے گھر چلے جاتے۔ اُن کے گھر میں شہناز بھابی ہماری خوب خاطر و مدارات کرتیں۔ اُن کے بچوں میں ہمیں نصرت بدر یاد ہیں۔ چھوٹے سے تھے نہایت ذہین، تیز وطرّار!

ہم بھی دلی یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کررہے تھے۔ پندرہ دن علی گڑھ رہتے اور پندرہ دن یونیورسٹی کے جُبلی ہال میں گزارتے۔ ہم علی گڑھ آجاتے تو بشیر بدر اکثر ہم

سے ملنے چلے آتے۔ محمد علی روڈ پر اسکائی لارک ہوٹل میں ہماری نشست رہتی۔ بشیر کے ساتھ احتشام اختر اور شہاب عراقی بھی ہوتے۔ کبھی کبھی غلام مرتضیٰ راہی بھی آجاتے یہ روڈویز میں کام کرتے تھے۔ اسکائی لارک ہمارے بچپن کے دوست انصار شمسی چلاتے تھے۔ بل نہ وہ لیتے تھے، نہ ہم دیتے تھے۔ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ قوم کے لے مرتے تھے۔ اُن دنوں علی گڑھ میں ہر دسویں دن فساد ہوتے تھے۔ ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ انصار فسادی تھے، مگر فساد کا دفع کرنا خوب جانتے تھے۔ ہوٹل کا آدھا آنگن، اینٹوں سے بھرا رہتا تھا۔ جنہیں توڑ کر گمّوں میں تبدیل کرلیا گیا تھا۔ فسادیوں نے بارہا محمد علی روڈ پر چڑھائی کی مگر ہر بار پسپا ہوئے۔ کمان انصار شمسی کے ہاتھ رہتی تھی۔ ہوٹل کے بالکل سامنے آتشبازوں کی مسجد کے عقب میں ضیاالدین کی نہاری اور کلچوں پائے کی دوکان تھی۔ نشست لمبی کھنچ جاتی تو انصار دعوت شیراز کا اہتمام کرتے۔ نہاری اور کلیجے پائے آجاتے۔ یہ شعروسخن کی محفل گرمانے والوں میں بشیر بدر، احتشام عراقی اور راہی کے علاوہ منا عرشی، جمناپرشاد راہی، محمد احمد شیون بھی پیش پیش رہتے۔ کبھی کبھی رامپور سے شہزادہ گلریز بھی آجاتے اُن کے ساتھ ایک عدد خوبصورت خاتون ضرور ہوتیں۔ جس کا تعارف وہ یہ کہہ کر کراتے ''آپ کی نئی بھابی''۔

انہی دنوں بشیر بدر کا پہلا شعری مجموعہ ''اکائی'' منصہ شہود پر آیا۔

بشیر بدر نے بڑی محبت سے اصرار کر کے ہم سے مضمون لکھوایا۔ جو کلام حیدری کے ہفت روزہ ''مورچہ'' گیا کے علاوہ دیگر رسائل میں بھی نقل ہوا۔ مضمون کی اتنی پذیرائی ہوئی کہ بشیر بدر کے ساتھ ساتھ ہم بھی مشہور ہوگئے۔ ہمارا تنقیدی شعور جگانے میں بشیر بدر کی غنائی شاعری کا بھی ہاتھ ہے۔

بعد میں بشیر بدر میرٹھ کالج چلے گئے۔ وہ لیکچرر ہوگئے تھے۔ میرٹھ کے فسادات میں اُن کا گھر جلا دیا گیا۔ مگر انہوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ عزم صمیم کے ساتھ اپنے انتشار اور اضطراب سے وہ جوجھتے رہے۔

پھر اطلاع ملی کہ اُن کی وفا کیش شریکِ حیات اُنہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ مرنے

والے کی یادیں رہ جاتی ہیں۔ بشیر بدر نقل مکانی کر کے بھوپال آ گئے۔ ہم ان دنوں آکاش وانی بھوپال میں معاون ڈائریکٹر تھے۔ وہ ہم سے ملنے آئے اُن کی نئی بیگم بھی ساتھ تھیں۔ ہم بہت خوش ہوئے۔ اُن کی پذیرائی کی اور اُنہیں چھوڑنے کے لئے اپنے کیبن سے باہر تک آئے۔ سواری اُن کے پاس تھی۔ وہ ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر کے مالک بن چکے تھے۔ گاہے بہ گاہے اُن سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ہماری تبدیلی ہوئی ہم ممبئی چلے آئے۔ عرصۂ محشر سے گزر کر بشیر بدر کارزار حیات میں سُرخ رو ہوئے۔ ہم نے انہیں ریڈیو کے آل انڈیا مشاعرے میں ممبئی مدعو کیا۔ وہ آئے تو مگر اب وہ بدل چکے تھے۔ شہرت اور دولت کی فراوانی نے اُنہیں پُرغرور بنا دیا تھا۔

آجکل وہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے طرفدار ہیں اور رام کی جنم بھومی ایودھیا کو اپنی جنم بھومی بتاتے ہیں۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ سیتا اُن کی ماں ہیں۔ خدا اُنہیں خوش رکھے، کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ بھلے مانس کو بگڑتے کیا دیر لگتی ہے۔

✪✪✪✪

کنور صاحب کا پہلا شعری مجموعہ اِسم اعظم ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ جسے پڑھ کر ہمیں احساس ہوا کہ یہ حزن و ملال کی شاعری ہے جس میں انسان کی ازلی اور ابدی تنہائی کا شدید احساس جاگزیں تھا۔ لہجہ کی سوزناکی نے ہم پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ موت پر ہم نے نظمیں کہی ہیں اور ہم سے پہلے اور بعد کے شاعروں نے بھی لیکن کنور صاحب کی نظم ''موت'' خیال اور اسلوب کی سطح پر انفراد و امتیاز کا شافع نمونہ ہے۔

ابھی نہیں ،ابھی زنجیر خواب برہم ہے
ابھی نہیں، ابھی دامن کے چاک کا غم ہے
ابھی نہیں ،ابھی درباز ہے اُمیدوں کا
ابھی نہیں، ابھی سینے کا داغ جلتا ہے
ابھی نہیں، ابھی پلکوں پہ خوں مچلتا ہے
ابھی نہیں، ابھی کم بخت دل دھڑکتا ہے

اس نظم کے بعد ہم نے شہریار کی شاعرانہ شخصیت کو قبول کر لیا تھا۔ ورنہ وہ ہمیں محض کنور صاحب کی حیثیت سے عزیز رہتے یا پھر زیادہ سے زیادہ علی گڑھ میگزین کے اڈیٹر کی حیثیت سے۔

جن دنوں وہ ممبئ میں مظفر علی کی امراؤ جان ادا کے لئے گانے لکھ رہے تھے۔ اکثر ہمارے دفتر چرچ گیٹ آجاتے، نزدیک ہی میں رسنا ریستوران تھا جہاں سے چلتی ہوئی بھیڑ کو دیکھا جاسکتا تھا۔ بات کرتے کرتے وہ خوش اندام چہروں میں کھو جاتے ہمارے چھیڑنے پر وہ کھُل کر مسکرا دیتے۔

اُن سے ربط وضبط کا سلسلہ ہم نے کبھی منقطع نہ ہونے دیا ادھر ''حاصل سیر جہاں'' کے عنوان سے اُنکا کلیات شائع ہوا ہے۔ کچھ دنوں پہلے لکھنؤ میں اُن سے رواروی میں ملاقات رہی اُن کی مسکراہٹ میں اضمحلال دیکھ کر احساس ہوا ''کیا یہی حاصل سیر جہاں' ہے۔

بھائی ایک دلچسپ بات یاد آگئی۔ ہم نے اپنے نشریات کے اُستاد کمال احمد صدیقی کے بڑے صاحبزادے آصف کمال کو دلی فون کیا۔ جو انجینئر نگ کر کے قالینوں کے کامیاب سوداگر بن چکے ہیں۔ کھنکناتی ہوئی آواز میں انہوں نے ہمیں خوش آمدید کہا اور یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ شہریار اُن کے یہاں ٹھہرے ہیں فون انہیں تھما دیا۔ ہم نے شرارت بھری آواز میں کمال صاحب کی شاعری پر جملہ چست کرتے ہوئے کہا۔ بھئی کنور صاحب ذرا کمال صاحب سے پوچھئے کہ وہ خراب شاعری کرنا کب بند کریں گے۔

''ہم unpleasant بات نہیں کرتے۔'' کنور صاحب نے رسان سے کہا۔

ہم نے ہنس کر موضوع بدل دیا اور جملے کی معنویت پر دیر تک غور کرتے رہے۔ بہت لوگوں کا ذکر ہوا۔ بہتوں کا باقی ہے۔ پروفیسر نذیر احمد جنہوں نے اسلوب احمد انصاری جیسے لائق و فائق شاگرد پیدا کئے۔ جو اپنے استاذ الاساتذہ کو اقبال پر اپنی پانچویں کتاب معنون کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں۔ ''فاضل محقق استاذی پروفیسر

نذیراحمد کے نام۔ بگرااِیں ہم سرمایۂ بارازمن!''

رشیداحمد صدیقی کے والہ وشیدا لائبریری سائنس کے پروفیسربشیرالدین جنہوں نے رشید صاحب کو زمین کاایک ٹکڑا خریدنے پر آمادہ کیاکہ وہ اپنا آشیانہ تعمیر کر کے سبکدوشی کے دن آرام سے گزاریں۔ انگریزی کے محمود خاں، صاحب تاریخ کے پروفیسر محمد حبیب، سیاسیات کے چودھری محمد سلطان اور ہاشم قدوائی صاحب جنہوں نے انورالحق حقّی کے ساتھ مل کر مغربی فکر و فلسفہ پراردو میں کئی کتابیں تحریر کیں۔ طارق صاحب، جمیل قادری صاحب ،افتخارممّا، عباس رضوی صاحب، منیر صاحب، جعفری صاحب، پروفیسرڈاکٹر بوس یہ سبھی ہمارے اُستاد تھے۔

پروفیسر انورانصاری اور جمال خواجہ صاحب شعبۂ نفسیات سے متعلق تھے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر ہم لوگ ادب سے کھڑے ہوجاتے تھے۔ جمال خواجہ عبدالمجید خواجہ کے بڑے صاحبزدے لوک سبھا کے رکن بھی رہے۔ ان کے برادر خُرد رویندر خواجہ علی گڑھ سے صوبائی اسمبلی کے لئے منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں پنڈت نہرو علی گڑھ یونیورسٹی تشریف لائے تو اپنے بزرگ ساتھی مجاہد آزادی عبدالمجید خواجہ کے مہمان رہے۔اب ان پرانی وضعداریوں کولوگ فراموش کرتے جارہے ہیں۔

نہرو، محمد علی جناح ،مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، سابق صدر جمہوریہ ہند راجندر پرشاد، عالمی شہرت یافتہ سائنس داں عبدالسلام، شاہ ایران رضا شاہ پہلوی، ملکۂ ایران ثریا، شاہ سعود اور ایسی ہی نہ جانے کتنی غیر معمولی شخصیات نے اپنی آمد سے اس عظیم دانش گاہ کو وزن و وقار عطا کیا۔ ان میں سے کچھ کو ہم نے بہت قریب سے دیکھا۔اُن پر پھول برسائے۔ یونین کی طرف سے معزز مہمانان کرام کو استقبالیہ دینے کی روایت برسوں سے چلی آرہی ہے اور ہمارے زمانے تک قائم تھی۔خدا کرے یہ روایت آج بھی زندہ ہو۔

✪✪✪✪

مشہور جاسوسی ناول نگار ''نیلی چھتری'' والے ظفرعمر اعلا پولیس افسر تھے۔ضلع

بجنور میں واقع غلام قادر روہیلہ کے قلعہ تک پہنچ گئے تھے۔ جو ڈاکوؤں اور رہزنوں کا مسکن تھا۔ مشہور زمانہ سلطانہ ڈاکو بھی انہی رہزنوں میں شامل تھا۔ علی گڑھ والے ظفر عمر اُسے پکڑنے کے لئے مامور کئے گئے تھے۔ سلطانہ ڈاکو اپنے وقت کا رابن ہڈ تھا، وہ امیروں کو لوٹ کر غریبوں کی مدد کیا کرتا تھا۔ ہالی وُڈ میں اُس کے متعلق ایک فلم بھی بنی تھی۔ جس کی شوٹنگ اسپین میں کی گئی تھی۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ''نیلی چھتری'' سے جاسوسی ناولوں کا آغاز ہوا تو غلط نہ ہوگا۔ شمشاد مارٹ کے نواح میں تعمیر کی گئی کوٹھی ''نیلی چھتری'' آج بھی ظفر عمر کی یادوں کو تازہ کراتی ہے۔

اب آیئے ایک اور ظفر عالم کا ذکر ہو جائے۔ ظفر نے انجینئرنگ کر کے علی گڑھ میں تالوں کی چھوٹی سی فیکٹری قائم کی، اُن کے تیار کردہ ''لنک'' تالے اتنے مشہور ہوئے کہ ہندوستان سے باہر کی منڈیوں میں بھی اُن کی مانگ بڑھتی گئی۔ انہوں نے پریشر کوکر بھی بنائے۔ غرض کہ ہارڈ ویئر کی دنیا میں اُن کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ ہم اُن کے سینئر ہیں ظاہر ہے اُن کی ترقی سے ہمارا دل شاد ہوتا ہے۔ علی گڑھ کو ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے۔ جو زندگی کے مختلف میدانوں میں امتیاز و انفراد قائم کریں تاکہ اُن کو مثال بنا کر نئی نسلیں اپنی راہوں کو روشن کرسکیں۔

وجے بجاج بھی علی گڑھ یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے ہیں۔ ان کا شمار بھی علی گڑھ کے بڑے صنعت کاروں میں ہوتا ہے۔ یہ بھی ہارڈ ویئر کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ نہایت باذاق آدمی ہیں سخن سنج اور سخن شناس، شہریار کو بہت عزیز جانتے ہیں۔ انہوں نے اپنا شعری مجموعہ ''نیند کی کرچیں'' وجے کمار بجاج کے نام معنون کیا ہے۔

انگریزی کے ممتاز صحافی طارق حسن خواجہ خاندان کے چشم و چراغ۔ انگریزی میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ علی گڑھ میں پی۔ ٹی۔ آئی کے نمائندے ہیں۔ ٹائمز آف انڈیا کے لئے بھی لکھتے رہتے ہیں۔ صحافت کا آغاز اُردو میں ایک موقر ہفت روزہ خیر و خبر کے اجراء سے کیا تھا۔ اسی اخبار میں پہلی بار ہم نے جاوید اختر کی نظمیں دیکھی تھیں۔ اب تو خیر سے اُن کا شعری مجموعہ ''ترکش'' بھی شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔

جاوید کا پیار کا نام جادو ہے وہ یونیورسٹی اسکول منٹو سرکل میں پڑھتے تھے۔ گزشتہ دنوں ہم علی گڑھ گئے۔ توصیف بھائی انہیں یاد کر رہے تھے۔ یہ ہمارے سینئر ہیں۔ پیشے سے انجینئر ہیں۔ وظیفہ یاب ہوکر علی گڑھ میں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے۔ نہایت شائستہ شریف اور وضع کے پابند۔ ہمیں دیکھتے ہی گلے سے لگالیا۔ جن دنوں یہ ڈپلوما انجینئرنگ میں پڑھتے تھے ان کی وجاہت پر لوگ رشک کرتے تھے۔ وجیہ ہونے کے ساتھ ساتھ شجیع بھی تھے۔ ہاکی بہت اچھی کھیلتے تھے۔ بدایوں کے ایک صاحبزادے جن کا ریکارڈ خاصہ مجرمانہ تھے اپنی شورہ پشتی کے زعم میں توصیف بھائی سے اُلجھ گئے بس پھر کیا تھا۔ توصیف بھائی نے اُنہیں ایسی پٹخنیاں لگائیں کہ صاحبزادے کو دن میں تارے نظر آگئے۔

ہمارے ایک اور سینئر عابداللہ غازی اسٹوڈنٹس یونین کے سیکریٹری اور صدر رہے۔ گفتار کے ساتھ ساتھ تحریر کے بھی غازی تھے۔ بعد میں امریکی شہریت اختیار کرلی۔ شکاگو میں مستقل قیام ہے۔ اقراانٹرنیشنل ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے صدر ہیں جس کے مراکز شکاگو، ہندوستان اور پاکستان اور یورپ کے بعض ملکوں میں قائم ہیں۔ مدارس اسلامیہ کے لئے جدید اور عصری علوم پر مبنی انگریزی میں سینکڑوں کتابیں مرتب کرچکے ہیں۔ ہمیں ان کے والد حامد انصاری غازی سے بھی بالمشافہ ملاقات کا شرف حاصل ہے جو اپنے وقت کے عظیم صحافی، ادیب اور شاعر تھے۔ آپ کو مولانا ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خاں جیسی عظیم المرتبت شخصیتوں سے فیض یاب ہونے کا سنہرہ موقع ملا تھا۔ عابد اللہ غازی کے چھوٹے بھائی طارق غازی ہمارے ہم جماعت تھے۔

✪✪✪✪

نواب مزمل اللہ خاں کو بھلا کون فراموش کرسکتا ہے۔ یونیورسٹی کے فروغ کے لئے انہوں نے جو گرانقدر خدمات انجام دیں انہیں رہتی دنیا تک فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اُن کی طویل وعریض کوٹھی مزمل منزل یونیورسٹی کے حدود اربعہ میں واقع ہے۔ اس تاریخی اور تہذیبی عمارت کا اپنا ایک کردار ہے۔ یہ ہمیشہ سے ضرورت مند طالب علموں کا

مسکن رہی ہے۔ جسے کہیں جگہ نہیں ملتی وہ یہاں ڈیرا ڈال لیتا ہے۔ یہ ایک ایسا گوشۂ عافیت ہے جو چھتنار درخت کے مانند پڑھنے لکھنے والوں کو گھنی چھاؤں فراہم کرتا ہے۔ نواب صاحب اور اُن کے ورثاء نے اس عظیم الشان ٹریڈیشن (Tradition) کو آج بھی قائم رکھا ہے۔

ہمارے بہت پیارے دوست اور ساتھی افسانہ نگار مہرالٰہی بہت ابتدا میں یہاں اقامت پزیر تھے۔ مشہور ماہر اسلامیات اور تاریخ داں فرّخ جلالی کو بھی یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ مزمل منزل کے مہمان رہ چکے ہیں۔

مہرالٰہی م۔ندیم کے نام سے افسانے لکھتے تھے۔ انہوں نے بچّوں کے لئے بھی قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔ادھر انہوں نے رشید احمد صدیقی کی حیات و خدمات پر بھی تحقیق و تدقیق کے باب روشن کیے ہیں۔ یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد ہر دو حضرات نے علی گڑھ میں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے۔ علی گڑھ کی یہی تو خوبی ہے کہ یہاں جو آیا یہاں کا ہولیا۔

علی سردار جعفری، اختر الایمان، خواجہ احمد عباس اور عصمت چغتائی جیسی برگزیدہ شخصیتوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کا ہمیں شرف حاصل ہے۔ جعفری صاحب، سلطانہ آپا اور جعفری صاحب کی بہنیں ستارہ جعفری اور رباب جعفری یہ سبھی لوگ ہمیں اپنے خاندان کے فرد کی طرح مانتے تھے۔اختر الایمان سے ہماری قربت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اکثر ہم کارٹر روڈ، باندرہ پر واقع اُن کے فلیٹ کی بیل کسی بھی وقت بجادیتے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہم نے اختر صاحب کے یہاں حاضری دی ہو اور انہوں نے ہمیں بغیر کھانا کھلائے جانے دیا ہو۔تقریباً ایسے ہی معاملات عباس صاحب کے ساتھ تھے۔ اُن کے انتقال سے کچھ دنوں پہلے ہم نے اُن سے ایک طویل انٹرویو لیا تھا۔ جو ہماری انٹرویوز کی کتاب ''زندہ اپنی باتوں میں'' کی زینت بنا۔عصمت آپا چرچ گیٹ پر رہتی تھیں۔ وہیں ہمارا دفتر تھا۔ آتے جاتے اُن سے ملاقات ہوجاتی تھی۔ یہ سبھی نابغۂ روزگار ہستیاں تھیں۔ جنہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں علم وفن کے چراغ روشن کئے۔ ممبئی پر جب

ہم زندگی کی کہانی ترتیب دیں گے تو ہماری کہانی کے مرکزی کرداروں کی صورت میں یہ
سبھی پیارے لوگ فہم وادراک کی جوت جگائیں گے۔

✪✪✪✪

''بابِ سرسید'' سے جیسے ہی آپ یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں بیس تیس قدم کے
فاصلے پر پندرہ بیس بیڈ پر مشتمل ایک چھوٹا سا ہسپتال ہے، جو خصوصی طور پر ہوسٹلوں میں
اقامت پذیر لڑکوں کے لیے ہے۔ یہ ہسپتال میڈیکل کالج کی نسبت کافی قدیم ہے۔
ہسپتال کے کیمپس میں سی۔ایم۔او اور دیگر اسٹاف کے لئے کوارٹرز بنائے گئے ہیں۔ جن
دنوں ہم بی۔اے کے سال اول کے طالب علم تھے۔ ڈاکٹر معشوق سی۔ایم۔او تھے!
اُنہیں مرغیاں پالنے کا شوق تھا۔ ہم اکثر نظر بچا کر اُن کی مرغیوں پر ڈاکا ڈالتے رہتے
تھے۔ ہمارے معاون وسیم شیروانی مرحوم ہوا کرتے تھے۔ایک دن ہم نے لپک کر مرغی
پکڑی اور سائیکل پر بیٹھ بس فرار ہوا چاہتے تھے کہ سی۔ایم۔او صاحب برآمد ہوئے۔
چھڑی اُن کے ہاتھ میں تھی۔ وہ تیزی سے ہماری طرف لپکے۔''رک جاؤ، بدمعاشو! آج
نہیں چھوڑیں گے''۔ ہڑبڑاہٹ میں مرغی ہمارے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور ہم پیڈل
مارتے ہوئے تیزی سے نکل گئے۔

کچھ دنوں بعد!

ہمارے بی۔اے۔ فائنل کے پیپر شروع ہو چکے تھے۔ابھی دو پیپر ہی دیئے تھے
کہ ہم ایک حادثے کے شکار ہو کر ہسپتال پہنچ گئے۔

پنڈت حبیب الرحمٰن شاستری کے بڑے صاحبزادے انوار ہمارے ساتھ تھے۔
پلک جھپکتے میں ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ وہی تھے جن کی مرغیاں ہم ہضم کر چکے تھے۔ انہوں
نے ہماری نبض دیکھی دل کی حرکت چیک کی اور اپنا چہرہ ہمارے چہرے کے نزدیک لا کر
بولے'' آخر کو دام میں صیاد آ ہی گیا''۔ یہ کہہ کر انہوں نے بڑے ڈرامائی انداز میں آلۂ
جراحت ہماری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔'' آج ہم اپنی تینوں مرغیاں تمہارے پیٹ سے
نکالیں گے۔'' اتنا سنتے ہی ہم بیہوش ہو گئے تھے۔

اصل میں سر کے زخموں کی اسچنگ کے لئے انیستھیسیا (Anasthesia) دیا گیا تھا۔ صبح ہم ہشاش بشاش اٹھے۔ دو چار دن لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو گئے۔ ہسپتال کی اسیری سے چھٹے تو اپنے مسیحا صفت ڈاکٹر سے آنکھیں ملاتے ہوئے نم دیدہ ہو گئے۔

✪✪✪✪

بیٹھے بٹھائے ہمارا جی چاہا تو ہم نے وسیم احمد کو فون کر لیا۔ علی گڑھ میں یہ ہمارے جونیئر تھے۔ آجکل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ایکزیکٹیو کاؤنسل کے ممبر ہیں۔ دو سال کے لئے راجیہ سبھا کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔ سونیا گاندھی کی کانگریس سے وابستہ ہیں۔ ہمارا بہت ادب کرتے ہیں، بہت زمانے تک علی گڑھ میں رہے۔ سیاست کا چسکا انہیں طالب علمی کے دوران ہی لگ چکا تھا۔ علی گڑھ کے پڑھے عارف محمد خاں مرکز میں وزیر توانائی تھے۔ وسیم اُن کا کلمہ پڑھتے تھے۔ دلّی اُن کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ عارف بھی اُن کا بہت خیال کرتے تھے۔

ہم اپنے بارے میں کیا عرض کریں۔ جن دنوں عارف محمد خان اپنے پیر و مرشد سابق ایم۔ پی پیلو مودی سے عملی سیاست کے سبق سیکھ رہے تھے ہم ''مارچ آف دی نیشن'' ایڈٹ کر رہے تھے۔ ۲/لودھی اسٹیٹ پر اخبار کا دفتر تھا۔ پیلو مودی نے ہمیں پوری آزادی دے رکھی تھی اور ادارتی معاملات میں بالکل دخل نہیں دیتے تھے۔ عارف وہاں ڈیرا ڈالے ہوئے تھے۔ مودی صاحب کی بات چھوڑیئے۔ وہ ہمارے سامنے بھی کرسی پر نہیں بیٹھتے تھے۔ یہ اُن کی نیکی اور شرافت ہی تھی۔ وزیر باتدبیر بننے کے بعد وہ مودی صاحب کو بھول گئے۔ حد یہ ہے کہ اُن سے ملنے جلنے سے بھی کترانے لگے۔ مودی صاحب بدستور حزب اختلاف کی اگلی صفوں میں تھے اور عارف حکمراں جماعت کانگریس کی آنکھ کا تارا بنے ہوئے تھے۔ وہ یہ فراموش کر بیٹھے تھے کہ وقت کے تیور بدلتے رہتے ہیں۔

خیر یہ تو تمہید تھی، ہم اصل مطلب کی طرف آتے ہیں۔ ہماری پوسٹنگ ممبئی میں تھی اور ہم ایک ایسے مسئلہ سے دوچار تھے جو ہمارے لئے مستقل اذیت بنا ہوا تھا۔ دلّی ہمارا

آنا جانا رہتا تھا۔ جامع مسجد پہاڑی بھوجلہ پر سعید خاں صاحب کے یہاں مستقل نشست رہتی تھی۔ جاوید حبیب۔اور وسیم بھی چلے آتے تھے اور سعید بھائی کا بیٹھکا ہمارا تو مستقل ٹھکانہ تھا ہی۔

ہم نے وسیم احمد کو اپنی پریشانی بتلائی۔انہوں نے ہمیں تسلی تشفی دی اور ہمیں عارف محمد خاں مرکزی وزیر بھارت سرکار کی کوٹھی واقع تین سنہری لین لے کر پہنچ گئے۔اپنی آمد کی اطلاع کرائی۔ ہم لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔کچھ دیر انتظار کرا کے عارف محمد خاں بھی آ گئے۔عزیزی وسیم احمد نے ہمارے مسئلہ کو اُن کے سامنے رکھا۔ مسئلہ کا حل کرنا تو دور کی بات انہوں نے دو لفظ محبت کے بھی نہ کہے اور یہ وہ شخص تھا جو یونیورسٹی میں ہمیں دیکھ کر چلتے ہوئے رکشے سے اُتر جاتا تھا اور مجال ہے کہ سلام کئے بغیر گزر جائے۔خیر میاں کبھی کی راتیں اور کبھی کے دن بڑے!

آج عارف محمد خاں کا حال یہ ہے کہ:

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

وہ ہمارے چھوٹے ہیں۔ ہم تو اُنہیں دعا ہی دیں گے۔خدا اُن کے دن پھیر دے۔ کچھ بھی ہو علی گڑھ والے ہیں۔

وسیم احمد کے طرز عمل میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ابھی دو چار دن پہلے ہم نے فون پر اُن سے کہا۔یار یہ تمہیں وسیم بھنڈی کیوں کہا جاتا ہے۔انہوں نے ذرا بھی بُرا نہ مانا،بس ہنسنے لگے۔

خط لکھنے میں ہمیں آلس آتا ہے۔بس جب جی چاہتا ہے۔ وقت ناوقت اپنے شناساؤں ، دوستوں اور دشمنوں سے فون پر بتیاتے رہتے ہیں۔کبھی کبھی اپنی پرانی محبوباؤں سے بھی کنکشن ملا لیتے ہیں۔ جہاد زندگانی میں جب عمل کی تلقین کی گئی تھی ہم اُس سے تقریباً محروم کر دئے گئے تھے۔اس لئے باتوں کو ہی اپنے لئے تسکین جان جانتے ہیں۔

ابھی ایک دن ہم اپنے استاد محترم صدیق الرحمٰن قدوائی سے فون پر رشید حسن خان

کی سوقیانہ مثنویوں سے دلچسپی کا سبب دریافت کر رہے تھے۔ انہوں نے ہنس کر کہا ''خان صاحب ہم سے بے تکلف تھے اور اپنی رنگین محفلوں میں کبھی کبھی ہمیں بھی شریک کر لیتے تھے۔تم جب دلّی آؤ گے تو رازہائے دورں سے پردہ اُٹھائیں گے۔فون پر بات کرنا ٹھیک نہیں''۔

قدوائی صاحب نے علی گڑھ سے پہلے سیاسیات میں اور پھر اردو میں ایم۔اے کیا۔ ہم سے عمر میں پانچ چھ سال بڑے ہوں گے۔ دلّی یونیورسٹی میں ہمارے استاد رہے گو کہ ماسٹر رام چندر پر تحقیق کر کے مُدرّس ہوئے کہ درس و تدریس کے پیشے کے لئے یہ لازم تھا۔اگر اُن کے دائرہ اختیار میں ہوتا تو وہ تحقیق و تدقیق کے دفتر کبھی نہ کھولتے۔تاثر نہ کہ تنقید کے وہ زیادہ قائل ہیں۔ عین جوانی میں اُن کی آنکھ زیادہ چلتی ہوگی شائد یہ اُسی کا نتیجہ ہے کہ وہ آجکل آشوبِ چشم کے شکار ہیں۔

گو کہ رشتہ ازدواج میں بندھے قدوائی صاحب کو تیں چالیس سال ہو گئے مگر وہ ہمیں آج بھی دولہا نظر آتے ہیں۔ہم بھی اُن کی شادی کے عصرانے میں شریک تھے۔ ذاکر صاحب، اندرا گاندھی اور عصمت چغتائی بھی تھیں۔

✪✪✪✪

حکایت لذیذ

مسعود ٹامی کو ہم نے دیکھا تو نہیں اُن کا ذکر بہت سنا تھا۔ یہ پرانے علیگ تھے۔اُن کے بارے میں یہ روایت سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے کہ انہوں نے راتوں رات اسٹریچی ہال کی چھت پر اونٹ چڑھا دیئے تھے۔ اس کی توثیق صدیق الرحمٰن قدوائی نے بھی کی۔ انہی مسعود ٹامی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُن پر کئی مہینے کی ہال فیس چڑھ گئی تھی جب تقاضہ بڑھا تو وہ پائیوں کی شکل میں ایک گدھے پر اپنی ساری ''فیس'' لاد کر لائے۔ ظاہر ہے ان پائیوں کا گننا جوئے شیر لانا تھا۔

☆

یونین کے طلباء عہد برادران جب منتخب ہو کر آتے ہیں تو اُن کی ایک مشترکہ تصویر اُتاری جاتی ہے۔ گروپ فوٹو کے لئے جب صدر، سکریٹری اور ارکان کابینہ جمع ہوئے تو ہمارے رفیق دیرینہ جمال مہدی بضد ہو گئے کہ وہ منتخب عہدیداران کے ساتھ گروپ فوٹو میں ہر قیمت پر شریک ہوں گے۔ بہت سمجھانے پر بھی جب وہ نہ مانے تو ہماری مداخلت پر انہیں فوٹو سیشن میں شریک کر لیا گیا۔

گروپ فوٹو میں سبھی منتخب اراکین کے نام اور عہدے دیئے جانے تھے۔ اجمال مہدی عرف الّن میاں، عہدیدار تو تھے نہیں۔ گروپ فوٹو فریم کر کے جب آویزاں کیا گیا، تو الّن میاں کو منصب عطا کیا جا چکا تھا۔ اُن کے نامِ نامی کے آگے بریکٹ میں پیون (Peon) ثبت تھا۔ یہ'' ایکٹیوٹی'' اُن کے ساتھ کس نے کی تھی، ہم کیوں بتلائیں، آپ خود اندازہ لگائیے!

ننھے میاں ہمارے بچپن کے دوست ہیں۔اُن کے والد عزت علی صاحب تحصیلدار تھے، انگریزوں کا زمانہ تھا۔ کوتوالی کے ایک حصے میں وہ باقاعدہ عدالت کرتے تھے۔

رہائش بھی تحصیل ہی میں تھی۔نہایت باوقار انسان تھے۔ شریفوں کا لباس چوڑی دار پیجامہ اور شیروانی زیب تن کرتے تھے۔ سر پر ترکی ٹوپی ہوتی تھی۔ شرع کے پابند تھے۔

ننھے میاں نیکر قمیص میں نظر آتے تھے۔ کیکر کی طرح دبلے پتلے تھے۔ اُن کے بڑے بھائی پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ ننھے اور اُن سے چھوٹے علی گڑھ میں آباد ہوگئے۔جن دنوں ہم ''راحت کدہ'' میں رہتے تھے۔ ننھے میاں امیر نشاں پر چار مینار ہوٹل چلاتے تھے۔ہمیں کھانے کی پریشانی ہوئی تو ہم نے ننھے میاں سے ذکر کیا۔ وہ بولے ''ہمارے ہوتے ہوئے کھانے کی پرواہ کیوں کرتے ہو۔تمہارا ہوٹل ہے،آج ہی سے شروع ہو جاؤ۔''

سلیم بھی ہمارے ساتھ ہو لئے۔ کھانا شروع ہوا،ہم نے بیس بائیس پھلکے کھائے۔ سلیم کہاں پیچھے رہنے والے تھے۔ایک پھلکے کا نوالہ بناتے اور غپا غپ کھائے جاتے۔ ننھے میاں خوشدلی سے مسکراتے رہے۔شام کو جمنازیم میں دو گھنٹے پسینہ بہانے کے بعد سیدھے چار مینار پہنچے۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ کتنی روٹیاں کھائیں۔ خاصے شکم سیر ہو کر ڈکار لیتے ہوئے نکلے ہی تھے کہ ننھے میاں نے بڑے پیار سے آواز دے لی۔ اور ہمارا ایڈوانس ہمارے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولے ''آج کا کھانا ہماری طرف سے،آگے سے ہم معذور ہیں۔''

ہم نے معصومیت سے پوچھا ''لیکن ننھے میاں ہمارا قصور کیا ہے؟''

''قصور تمہارا نہیں ہمارا ہے کہ ہم نے ہوٹل کھولا''۔

''ننھے میاں کچھ تو بچپن کی دوستی کا خیال کیجئے''۔ ہم نے التجا کی۔

''ہم تو چاہتے ہیں لیکن کیا کریں۔ روٹی پکانے والا بھاگ گیا، کہتا تھا، پہلے ان بھوتوں سے پیچھا چھڑائیے، پھر آئیں گے۔''

☆

ایس۔ایم۔نسیم صاحب ہمارے بعد کے علیگ ہیں یا پہلے کے یہ تو ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے، لیکن اردو ادب اور شاعری سے والہانہ شغف رکھتے ہیں۔ گفتگو میں اشعار

کا برجستہ استعمال کرتے ہیں۔ حسینوں کی محفل میں زعفران زار ہو جاتے ہیں خود بھی ہنستے ہیں اور دوسروں کو بھی ہنساتے ہیں۔ ہمارے اور اُن کے مشترکہ دوست انعام صاحب کی نصف بہتر چاندنی کے نام سے افسانے اور ناول لکھتی ہیں۔ چاندنی کی مناسبت سے ماشاء اللہ وہ خود بھی چندے آفتاب چندے مہتاب ہیں۔ اُن کا رومانی ناول ''غبار'' نہایت مقبول ہوا تھا۔ دیدہ زیب ٹائٹل کے آخری صفحہ پر چاندنی روشن تھی۔ ہماری آنکھیں چکا چوندھ ہو گئیں تو بھلا عام قاری کا کیا ہوا ہوگا۔ ہر ناول کے ساتھ اُن کی تصویر ضرور شائع ہوتی ہے۔

اُن کے یہاں ایک دن ڈنر پر ہم مدعو تھے۔ نسیم صاحب بھی بہ نفس نفیس موجود تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کے جونیئر رضوان احمد بھی تھے۔ یہ آجکل کانپور زون کے آئی۔ جی ہیں۔ ہمیں دیکھ کر اور ہم سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ علیگ جو ٹھہرے۔ اتنے میں بیگم انعام نے اپنا نیا ناول اُن کی خدمت میں پیش کیا اور پڑھنے کی درخواست بھی کی۔ نسیم بھائی نے ٹائٹل پر نظر ڈالی اور خوشدلی سے بولے آپ کی تصویر کہاں ہے؟ پہلے وہ تو دیکھ لیں! ہمیں یقین ہے آپ کے قارئین تصویر کو زیادہ پڑھتے ہوں گے''۔ تو یہ ہیں ہمارے شفیق دوست ایس۔ ایم نسیم آئی۔ پی۔ ایس، سابق ڈائریکٹر جنرل پولیس! نسیم بھائی کے آراستہ پیراستہ ذوق جمال کے پیش نظر ہمیں غالب کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔ سو لکھ دیتے ہیں!

حرارت باقی ہے جب تک لہو میں
کمی آئے نہ ذوق جستجو میں

جاوید عثمانی جنہوں نے آئی۔ اے۔ ایس میں ٹاپ کیا تھا علی گڑھ یونیورسٹی کے تربیت یافتہ ہیں۔ آجکل وزیر اعظم کے دفتر کے ساتھ منسلک ہیں۔ انیس انصاری آئی۔ اے۔ ایس کی میرٹ لسٹ میں تھے۔ علی گڑھ سے ایل۔ ایل۔ ایم کیا تھا۔ شاعری کا منزہ ذوق رکھتے ہیں۔ تین شعری مجموعوں کے مالک ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں خلیل الرحمٰن اعظمی کو اپنی غزلیں دکھا لیتے تھے۔ اُن کی زوجۂ ثانی ملک کی مشہور فیشن

ڈیزائنر ہیں۔ انیس بھائی سے ہماری صاحب سلامت ہے۔ ایک ادبی تقریب میں پہلی بار ملاقات ہوئی، تو ہمارے برابر آکر بیٹھ گئے اور رسان سے بولے ''انیس انصاری! ہمیں آپ کی شاعری پسند ہے''۔ اترپردیش سرکار میں چیف سیکریٹری کے مساوی عہدے پر فائز ہیں۔ ادیبوں شاعروں سے محبت ہی نہیں اُن کی سرپرستی بھی کرتے ہیں۔

ہمارے جونیئر زمیں پیغام آفاقی دلّی میں ڈپٹی کمشنر پولیس ہیں۔ اُن کا ناول ''مکان'' پڑھ کر ہم اُن کے عاشق ہوگئے۔ مکان کو ہم کائنات کا استعارہ مانتے ہیں۔ ایک ایسی سرائے جہاں کا عارضی قیام ہمیں جینے کے ہاتھوں مرنے کی داستان سناتا ہے۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مرچلے

پیغام کا ادبی سفر جاری ہے۔ ان کی دونئی کتابیں ''مافیا'' اور ''درندے'' اسلوب اور اظہار کی معنوی کائنات کا یگانہ نمونہ ہیں۔

لو بھائی سید محمد اشرف بھی تو ہیں۔ ان کی کہانی ''ڈار سے بچھڑے'' اور ناولٹ ''نمبردار کا نیلا'' ادبی دنیا میں دھوم مچا چکے ہیں۔ نہایت شریف اور نستعلیق اور ارادت مند! وہ ادب کی دنیا میں یقیناً امتیاز قائم کریں گے۔ یہ ہماری پیش گوئی ہے۔ علی گڑھ والوں کے لئے جی جان سے حاضر رہتے یں۔ ادیب دوستوں کی دامے، درمے، سخنے ہمیشہ مدد کرتے رہتے ہیں۔ گزشتہ برس ہم علی گڑھ گئے انہیں فون کیا نہایت محبت سے پیش آئے اور اصرار کرکے گھر بلالیا۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد بہار کا ذکر چھڑ گیا جہاں ہم ڈائریکٹر رہ چکے تھے کسی طرح جان بچا کر نکل آئے۔ ہم نے بلند آواز میں اپنے تلخ تجربات بیان کرنا شروع کردیئے، ابھی ہم تمہید پر ہی آئے تھے کہ اشرف نے ہنستے ہوئے انکشاف کیا۔ ''فیاض بھائی خاتون خانہ بہار کی ہیں۔ ذرا دھیرے بات کیجئے۔ آپ کی ضیافت کا اہتمام وہی کررہی ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ چائے سے بھی جائیں۔'' اور ہم نے جھٹ سے پینترا بدلا اور بہار اور بہار والوں کی تعریف میں ڈونگرے برسانے لگے۔

آجکل اشرف دلّی میں انکم ٹیکس کمشنر ہیں۔

✪✪✪✪

نواب زادہ لیاقت علی خان وزیراعظم پاکستان ہوئے۔ یہاں ہم کوئی سیاسی بحث نہیں چھیڑنا چاہتے۔ ہم دوقومی نظریہ پر بھی کوئی بات نہیں کریں گے۔حق میں نہ اس کی مخالفت میں! یہ تو اہل سیاست کا کام ہے، وہ جانیں۔ ہم اس پچڑے میں کیوں پڑیں۔ ہم تو محض اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ نواب صاحب کے خمیر وضمیر میں علی گڑھ کی مٹی بھی شامل ہیں۔نہایت کشادہ دل و دماغ والے تھے۔ بقول قرۃ العین حیدران کی بیگم المورڑا کے پنت خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔جو مذہباً عیسائی تھا۔اُن کا اصلی نام آئرن تھا۔انہوں نے ازابیلا تھورن کالج لکھنؤ میں پڑھا تھا۔ Economics میں لکھنؤ یونیورسٹی سے گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ نواب زادہ صاحب کی زوجۂ ثانی تھیں۔ پاکستان میں بیگم وزیراعظم کی حیثیت سے انہوں نے ساڑی ترک کی اور غرارہ رائج کیا۔ وہ گلے میں ہمیش حمائل شریف پہنے رہتی تھیں۔ وہ ہالینڈ میں سفیر بھی رہیں۔ اُن کا اسلامی نام رعنا تھااور نواب زادہ لیاقت علی خاں نے نئی دہلی میں اپنی کوٹھی کا نام بھی اسی مناسبت سے ''گل رعنا'' رکھا تھا۔ یہ کوٹھی اب پاکستان ہائی کمشنر کی رہائش کے لئے مخصوص ہے۔

دلّی کے سابق وزیراعلا صاحب سنگھ ورما بھی علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علم رہے۔اُن کا تعلق بی۔جے۔پی سے تھا۔آئیڈیولوجی سے قطع نظر وہ نہایت شائستہ،شریف اور مہذب انسان تھے۔علی گڑھ والوں سے انہوں نے اپنے محبت کے اٹوٹ رشتے کو ہمیشہ استوار رکھا۔ابھی پچھلے دنوں ایک موٹر حادثے میں اُن کا انتقال ہوگیا۔

راجہ مہندر پرتاپ سنگھ آزادی کے سپاہی، گنگا جمنی تہذیب کے عاشق اور ہند اسلامی کلچر کے مویّد جب تک جئے اپنی مادر درسگاہ پر جان چھڑکتے رہے۔ ہماری نظر میں اُن کی اہمیت اور قدر و قیمت کسی طرح ابوالکلام آزاد، رفیع احمد قدوائی اور مولانا اسد مدنی سے کم نہیں۔

سب کہاں ! کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں ،کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

پسِ نوشت

۳۴-۱۹۳۳میں ترکی ایک مشہور مجاہدہ اور دانش ور خاتون خالدہ ادیب خانم جامعہ ملیہ اسلامیہ میں توسیعی لیکچر دینے دلّی تشریف لائیں، تو ان جلسوں کی صدارت گاندھی جی، ڈاکٹر اجمل انصاری، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر بھگوان داس، مولانا سیّد سلیمان ندوی، بھولا بھائی دیسائی، مسز سروجنی نائیڈو اور علامہ اقبال نے کی۔ یہ لیکچر انگریزی میں دیے گئے تھے۔ دہلی کے علاوہ انہوں نے لاہور، پیشاور، علی گڑھ، لکھنؤ، بنارس، کلکتہ، حیدر آباد دکن اور ممبئی کی بھی سیر کی۔ اور وطن واپسی کے بعد اپنے اس دورے کی روداد انگریزی میں "Inside India" کے نام سے سپردِ قلم کی۔ گاندھی جی کی سرگرمیوں کا جائزہ تفصیل سے لیا گیا ہے اور ان کی انہوں نے بے انتہا تعریف وتوصیف کی۔

علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کے طلباء نے جس جوش اور جذبے کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہا اِس کی نظیر یونیورسٹی کی تاریخ میں شاید ہی ملے۔ اُن کے اعزاز میں اسٹوڈنٹس یونین کی جانب سے سیّد سجاد حیدر یلدرم کی صدارت میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ مجاز نے خیر مقدمی نظم پڑھی۔ پھر اردو میں استقبالیہ تقریریں ہوئیں۔ اُردو زبان کا جو صوتی اثر انہوں نے قبول کیا، اُس کے بارے میں انہوں نے اپنی متذکرہ کتاب میں لکھا۔ ''مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اردو میں فارسی سے زیادہ حسن ہے۔ اس کی ہم آہنگی، حرکت آفریں، قوت اور لفظ کی شان وشوکت نے مجھ پر اثر کیا''۔

لکھنؤ میں خالدہ ادیب خانم کی میزبانی کا شرف محمد نسیم بیرسٹر کے گھرانے کو ملا۔ محمد نسیم کے بیٹوں کا شمار برصغیر کے ممتاز دانشوروں میں ہوتا ہے۔ ان میں محمد وسیم چودھری خلیق الزماں کے ماموں زاد بھائی بھی تھے اور بہنوئی بھی۔ وہ پاکستان کے پہلے

ایڈوکیٹ جنرل تھے۔ ان کے بیٹے محمد حلیم پاکستان سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں۔ محمد نسیم کے دوسرے بیٹوں میں پروفیسر محمد حبیب ہماری یونیورسٹی کے تاریخ کے شعبہ کے سربراہ تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ محمود غزنوی اور اُس کے عہد پر آپ کو سند کا درجہ حاصل تھا۔ اسی طور پر پروفیسر محمد مجیب کے نام نامی سے بھلا کون واقف نہیں۔ ذاکر صاحب کے بعد آپ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے برسوں وائس چانسلر رہے۔ اعلا پائے کے ڈرامہ نگار، ماہر تعلیم، مورّخ و ادیب تھے۔ لکھنؤ میں خالدہ ادیب خانم اسی ممتاز علمی گھرانے کی مہمان رہیں۔ لکھنوی تہذیب سے وہ اس قدر متاثر ہوئیں کہ انھوں نے اپنی کتاب میں ایک باب 'بیگمات اودھ' کے عنوان سے تحریر کیا۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ ہم تو یہ سوچ کر خوش ہو لیتے ہیں کہ جس یونیورسٹی میں ہم نے نو برس گزارے، وہاں کیسی کیسی یکتائے زمانہ ہستیاں تشریف لائیں۔

✪✪✪✪

یادوں کے چمن میں کتنے چہرے ہیں، جو اپنی رنگینی خوشبو سے ہمیں سرشار کیئے ہوئے ہیں۔ ہمیں سعد ہاشمی یاد آئے۔ شہناز ہاشمی کے بڑے بھائی! جو انڈین فارن سروس کے معزز ترین برگزیدہ رکن رہے تھے۔ اُن کے ساتھ ساتھ ہمیں احترام صاحب کا خیال آیا۔ جنھوں نے کچھ دنوں ہمیں انگریزی پڑھائی تھی۔ نہایت خوشدل اور خوش شکل نوجوان تھے۔ جلد ہی آئی۔ اے۔ ایس کے لئے منتخب ہوگئے اور ہم لوگوں سے الوداع لی۔ جامعہ کے موجودہ وائس چانسلر مشیر الحسن ہمارے بعد علی گڑھ آئے۔ آشوبِ علی گڑھ پر ہمیں انڈین ایکسپریس میں اُن کا مضمون پڑھ کر پتہ چلا کہ یہ بھی علیگ ہیں۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے پلیٹ فارم سے یونین کا الیکشن لڑا تھا اور اس طرح کٹھ ملائیت کے خلاف عَلم اٹھانے کا حوصلہ دکھایا تھا۔

✪✪✪✪

یہاں ہمیں خیال آیا کہ موجودہ نائب صدر جمہوریۂ ہند حامد انصاری پُرانے علیگ

ہیں۔ منٹو سرکل اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم۔اے کیا، لیکچرر ہوئے اور پھر آئی۔اے۔ایس میں آ گئے۔ سعودی عربیہ میں ہند کے سفیر رہے۔ پھر علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ سبکدوشی کے بعد مرکزی اقلیتی کمیشن کے چیئر مین رہے۔

بین الاقوامی غالب سمینار کے افتتاح اور تقسیم غالب انعامات کے لئے آپ بہ نفس نفیس تشریف لائے۔ ''اقبال: ایشیائی بیداری کا شاعر'' کے موضوع پر اُن کی مدلّل تقریر سن کر ہمارا جی خوش ہوگیا۔ ذاکر صاحب کے بعد حامد انصاری دوسرے ممتاز شخص ہیں جو نائب صدر جمہوریہ ہند کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔

محمد شفیع قریشی علی گڑھ کے پڑھے ہیں۔ کشمیر میں مولوی فاروق کی رہائش گاہ نگین حضرت بل پر اُن سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔ بھائی شفیع قریشی مرکزی وزیر کے علاوہ مدھیہ پردیش اور اُترپردیش کے گورنر رہ چکے ہیں۔ آجکل چیئر مین اقلیتی کمیشن حکومتِ ہند ہیں۔

شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ، خواجہ غلام محمد صادق، میر قاسم، شمیم احمد شمیم، مرزا افضل بیگ، غلام محمد چکن، دین محمد بانڈے یہ سبھی مقتدر شخصیتیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پروردہ ہیں۔ اور نہ جانے کتنے گہر ہائے آبدار اس دانش کدہ سے روشنی حاصل کر کے آفتاب و ماہتاب کے درجات اعلا تک پہنچے۔

ہمیں خیال آتا ہے ہمارے استاد مغیث الدین فریدی نے اپنے شعری مجموعہ ''کفرِ تمنا'' میں کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے جن اساتذہ کے خرمنِ ادب سے خوشہ چینی کی ہے، اُن میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر مسعود حسین خاں جیسے بزرگان.ادب کے نام سرفہرست آتے ہیں۔

فریدی صاحب شیخ سلیم چشتی کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ نہایف شریف النفس، بیدار مغز اور حساس طبیعت کے اُستاد تھے۔ غزل کہنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔

''اُن کے غم کی دھیمی اور پر سوز لے نے اُن کے اشعار کو نوائے سرمدی یا غالب کا تیر نیم کش بنا دیا۔ فریدی صاحب کی غزل کو اُن کے دل کے لہو نے سنوارا ہے اور لفظ و محاورہ کی نبض شناسی نے اُن کے فن کے حُسن کو نکھارا ہے۔'' یہ ہم نہیں کہہ رہے قبلہ خواجہ احمد فاروقی کی رائے ہے۔ دو ایک شعر بھی سُن لیجئے:

جاتی ہی نہیں دل سے تیری یاد کی خوشبو
میں دورِ خزاں میں بھی مہکتا ہی رہا ہوں

دیر تک ساتھ نہ دے گا یہ جہاں گزراں
محفل دہر کو تم آئینہ بن کر دیکھو

رات محفل میں وہ تھا دیدہ و دل کا عالم
جیسے چلتی ہوئی تلوار سے تلوار ملے

ہم جیسے سخن ناشناس کو سخنور اور سخن شناس کہہ کر دل بڑھاتے تھے اللہ اللہ کیا لوگ تھے۔ اب ایسے دیدہ وروں کو ڈھونڈتے رہیے۔

✪✪✪✪

ان دنوں ہم آل انڈیا ریڈیو بمبئی میں معاون ڈائریکٹر تھے۔ بغیر کسی اطاع کے اچانک ایک بزرگ ہمارے کمرے میں داخل ہوئے اور اپنا ہاتھ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''میاں ہم منظور حسین شورؔ ہیں۔ پرانے علیگ''۔ ہم ہڑبڑا کر اُن کی تعظیم میں کھڑے ہو گئے۔ بڑے ادب کے ساتھ انہیں کرسی پیش کی۔ چائے سے تواضع کی۔ ہم سے باتیں کرکے اور یہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ ہم بھی علی گڑھ والے ہیں۔ جاتے جاتے اپنا شعری مجموعہ عنایت کر گئے۔ اپنا پتہ بھی درج کیا۔ بی۔ فیڈرل ایریا۔ کراچی میں رہتے تھے۔ اُن سے منسوب ایک دلچسپ واقع سُن لیجئے۔ جسے آل احمد سرور نے اپنے مضمون ''ہمارے زمانے کا علی گڑھ'' میں بڑے مزے سے لکھا ہے۔

''منظور حسین شور فارسی میں ایم۔ اے کر رہے تھے۔ جب ایم۔ اے فائنل کا امتحان ہوا تو اسٹریچی ہال میں ایم۔ اے کے ساتھ بی۔ اے کے طلباء کی بھی سیٹیں تھیں۔

نگراں پرچہ بانٹتے وقت پوچھتے تھے، ایم۔اے کا پرچہ چاہئے یا بی۔اے کا۔ غلطی سے منظور حسین شور کو بجائے ایم۔اے کے بی۔اے کا پرچہ دے دیا گیا۔ ان حضرت نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ پرچے پر بی۔اے لکھا ہوا ہے۔ جب تین گھنٹے بعد امتحان ختم ہوا تو باہر نکلے۔ میں نے برآمدے میں ان کو دو ایک ایم۔اے فارسی کے لڑکوں سے بات کرتے دیکھا۔ شورؔ نے کہا کہ پرچہ بڑا آسان تھا کسی نے کہا کہ یہ تو خاصہ مشکل تھا ہر ایک نے اپنا پرچہ دکھایا۔ پتہ چلا منظور حسین شورؔ صاحب بی۔اے کا پرچہ کر کے چلے آئے تھے۔ گھبرا کے اندر گئے۔ ان کی خوش قسمتی سے ڈاکٹر ہادی حسن صدر شعبۂ فارسی ہیڈ نگراں تھے۔ انہوں نے جا کر اپنی رام کہانی سنائی۔ اُس وقت کاپیاں یکجا کی جا رہی تھیں۔ ہادی صاحب نے ان کا ہاتھ پکڑا اور ایک کونے کی سیٹ پر بٹھا دیا۔ دوسرے نگرانوں سے کہا۔ ''آپ جایئے میں ان کا نگراں ہیں۔ چنانچہ پورے ہال میں ایک امیدوار منظور حسین شور اور ان کے نگراں ڈاکٹر ہادی حسن صاحب پورے تین گھنٹے بیٹھے رہے۔ منظور حسین اچھے طالب علم تھے۔ چنانچہ ان کی فرسٹ کلاس آئی۔ منظور حسین شور کا حال ہی میں کراچی میں انتقال ہوا ہے۔ امراؤتی کے رہنے والے تھے۔

دنیا ایک ہنگامے پہ موقوف ہے۔ سرور بھی نہیں شورؔ بھی نہیں ہادی بھی نہیں مگر رہتی دنیا تک اُن کے تذکرے ہوتے رہیں گے۔ شاید ان عبقری شخصیتوں کے ذاکر کی حیثیت سے کبھی کوئی اللہ کا نیک بندہ کلمات خیر میں ہمیں بھی شامل کر لے۔

✪✪✪✪

چلو بس اب زندگی کی دوپہر ڈھلنے کو ہے وارث
ابھی امکان ہے شائد وطن کی شام مل جائے

حزن و ملال کے شاعر وارث کرمانی سے ہماری پرانی یاد اللہ ہے۔ وہ اردو، فارسی اور غزل کے ساتھ ساتھ انگریزی کے اسکالر بھی ہیں۔ اپنی فکر انگیز تنقید اور کلاسیکل رچاؤ والی شاعری کے لئے وہ تا دیر ادب میں یاد رکھے جائیں گے۔ اُن کا بنیادی ڈسپلن فارسی زبان و ادب کی تحقیق و تدقیق ہی نہیں وہ جدید فارسی میں شعر بھی کہتے ہیں۔ عرفی و

صائب سے انہیں عشق کی حد تک لگاؤ ہے۔ حافظ، خسرو اور غالب کی منفرد عشقیہ شاعری کو بھی انہوں نے مرکز نگاہ بنایا ہے۔ غالب کے خصوصی مطالعہ کے تحت انگریزی میں آپ نے دو غیر معمولی کتابیں تخلیق کی ہیں

Evaluation of Ghalib's Persian poetry

اور

Tradition and rationalism in Ghalib

اُن کا ایک اور کارنامہ ہندوستان کے منتخب فارسی شعرا کے کلام کی تدوین وتہذیب بھی ہے۔ جو Dreams forgotten کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ منتخب فارسی کلام کے ساتھ شاعر کا تعارف بزبان انگریزی کتاب میں شامل ہے۔

جن دنوں ہم علی گڑھ میں پڑھتے تھے وہ اکثر آرٹس فیکلٹی میں نظر آتے تھے۔ کچھ دنوں انہوں نے پہلے انگریزی پڑھائی اور بعد میں مستقل طور پر شعبۂ فارسی سے وابستہ ہو گئے۔ علی گڑھ میں اُن کا قیام اللہ والی کوٹھی میں تھا۔ انہوں نے فراغت کی زندگی گزاری، گھر کے آسودہ ہیں، دیوا شریف میں ہم ان کے یہاں دعوت کھا آئے ہیں جب تک ہاتھ پاؤں چلتے رہے لکھنؤ میں ہمارے دفتر اور گھر تشریف لاتے رہے۔ معاشقوں کی روداد بڑی دلچسپی سے سنتے ہیں اور عشق کی ناکامیوں پر خود بھی آبدیدہ ہو جاتے ہیں اور عاشق نامراد کو بھی رُلا دیتے ہیں۔ عہدِ جوانی میں اُن کی رنگینیٔ طبع خوب رنگ لائی۔ کسی ایرانی معشوق کے تیر نظر کے ایسے شکار ہوئے کہ جان پر بن آئی۔ برسوں تک دل میں اُس کی تصویر سجائے رہے۔ ہجر میں جب راتوں کی نیند حرام ہو گئی تو انہوں نے ایران کے لئے کمر باندھی اور لذت وصل کے خواب دیکھتے عشوہ طراز محبوب کے آستانے پر جا سجدہ ریز ہو گئے۔ ابھی حالت سکر میں تھے کہ بت طناز حسینہ مہ جبینہ نے یہ کہہ کر اُنہیں جگا دیا۔ ''اوہ پیارے وارث تم پر تو ضعف کا غلبہ ہو چکا ہے، جس جوان رعنا سے میں عشق کرتی تھی وہ کہاں گم ہو گیا؟؟؟'' انہوں نے بہت آہ وزاری کی محبت کے واسطے دیے۔ سفر کی صعوبتیں گنوائیں، اپنے جذبہ عشق کی صداقت کے حوالے دیئے

مگر اُس ستم پیشہ کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور بے چارے ستم دیدہ، عشق پیشہ وارث کرمانی آہ وزاریاں کرتے نامُراد ہندوستان پلٹ آئے۔ خدااُن کی جھولی کو صبر سے بھر دے۔ ہم یہ حکایت دلپزیر اُن کے ہی ایک شعر پر ختم کرتے ہیں۔

خدا کہاں ہے کسی نے مجھے نہ بتلایا
سوال سب سے کیا تھا جواب اُس نے دیا

✪✪✪✪

جاوید دانش، بیدار بخت اور عابد رضا بیدار کا خمیر وضمیر علی گڑھ کی مٹی سے اُٹھا۔ یہ حضرات ہماری طرح لکھنے پڑھنے کے شوقِ فضول میں مبتلا ہیں۔ جاوید دانش آنرز کر کے نئی دنیاؤں کی تلاش میں کینڈا جا نکلے۔ پھر نہ جانے اُن کے دل میں کیا سمائی کہ انہوں نے سند باد کا وطیرہ اختیار کرلیا۔ انہوں نے محض آوارگی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ندید آوارگی کو اپنا شعار بنالیا۔ آوارگی کو یوروپی ممالک اور امریکہ تک محدود رکھا۔ ندید آوارگی کے لئے جاپان کا انتخاب کیا۔ جاپان کا سفرنامہ پڑھ کر جاپان کی تاریخ اور تہذیب سے ہم اتنے متاثر ہوئے کہ ہم نے قصد کرلیا، جاپان ضرور جائیں گے۔ دیکھیں یہ آرزو کب پوری ہوتی ہے۔ جاپانی نوٹنکی دیکھنے کا اشتیاق ہے۔ گیشا گرلز سے استفادے کا بھی ارمان ہے۔

بیدار بخت علمی آدمی ہیں ۔اختر الایمان ، مجروح کے علاوہ انہوں نے اردو کے نئے پرانے شاعروں کو انگریزی قارئین سے متعارف کرا کے زبان وادب پر احسان کیا ہے۔ پیشے سے انجینئر ہیں۔ مگر ادب کے کل پرزے چمکانے کا کام بطریق احسن کرتے ہیں۔

عابد رضا بیدار، جز وقتی نہیں کل وقتی ادیب ہیں۔ لائبریری سائنس کے ماسٹر ہیں۔ علی گڑھ کے علاوہ پٹنہ کی خدابخش لائبریری میں محفوظ نادر و نایاب مخطوطوں کی اشاعت کا کام بہ حسن وخوبی انجام دے چکے ہیں۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔ خوب چونچال ہیں اور اپنے وطن رامپور میں سیف وسبو سے شغل کرنے کے بجائے قلم کو رگِ جان بنائے ہوئے ہیں۔

✪✪✪✪

شمیم قریشی علی گڑھ میں دو برس گزار آئے ہیں۔ انگریزی کے ایم۔اے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو دلّی کی اردو سروس سے برسوں وابستہ رہے مگر بڑے طمطراق کے ساتھ آکاشوانی میں دو ہی لوگ تھے جو ایمبسڈر میں دفتر میں داخل ہوتے تھے۔ایک شمیم قریشی اور دوسرے ڈائریکٹر جنرل! ہمارے برسوں کے دوست ہیں۔ ہم دلّی جاتے ہیں تو ہماری ضیافت میں کوئی کور کسر نہیں اُٹھا رکھتے۔ پریس کلب دلی کے سیکریٹری رہ چکے ہیں۔ آجکل اردو چینل کے ایڈوائزر ہیں۔ یاوا گوئی کے شوقین ہیں اور ایسی ملاّ خیاں سناتے ہیں کہ بس طبیعت خوش کر دیتے ہیں۔ دلّی والے جو ٹھہرے۔ ان کی گالیوں میں بھی مٹھاس ہے

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

☆

علی گڑھ کے حوالے سے ہم نے زندگی کی آدھی ادھوری داستان بیان کر دی۔ ہمیں گمان ہے آنے والی نسلوں میں پھر کوئی فسانہ گو پیدا ہوگا اور ہماری آدھی ادھوری داستان کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا۔ جاتے جاتے شعر سناتے جائیں۔

بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

✪✪✪✪